

اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان
ماہنامہ
الغوث
جون۔2026
یا حسین
مدیر اعلیٰ
مُفتی سید شہباز اصدق غوثی
ناشر
خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

زیر سرپرستی: وارث مسند غوثیہ سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی چشتی قادری صاحب

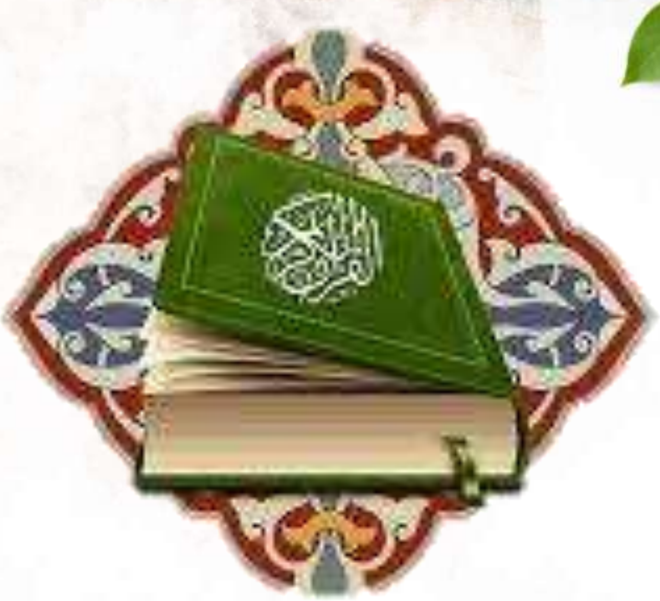
اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

ماہنامہ

الغوث

ذوالحجہ / محرم الحرام ۱۴۴۷ھ

جون 2026



مدیر اعلیٰ

مفتی سید شہباز اصدق غوثی

خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

مشمولات

تزئین وترتیب

الحمد گرافکس

نوٹ: مضمون نگار اپنے قیمتی مضامین ہمیں درج ذیل واٹس ایپ نمبر یا ای میل پر ارسال کریں۔

ssasdaque@gmail.com +27838463037

ماہنامہ

الغوث

جلد: 1، شمارہ: 6۔ جون 2026
ذوالحجہ / محرم الحرام ١٤٤٧ھ

مدیر اعلیٰ:
مفتی سید شہباز اصدق
+27838463037

معاونین
مولانا تبارک حسین امجدی
مفتی سبحان رضا امجدی

رفقائے ادارہ
حضرت علامہ
سید محمد علیم الدین اصدق مصباحی صاحب
(ساؤتھ افریقہ)
حضرت علامہ افتخار احمد قادر مدنی صاحب
(مدینہ منورہ)
حضرت پروفیسر سید شمیا نجیب گیلانی صاحب
(انڈیا)

ناشر
خانقاہ غوثیہ اصدقیہ، سہسرام، روہتاس بہار
09097467826

ای میل
ssasdaque@gmail.com

نوٹ

اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے ادارہ اور ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

احباب خانقاہ کے نمبر پر رابطہ کر کے ہر ماہ رسالہ مفت حاصل کریں۔

گزارش

علم دوست حضرات Rs786 کے ذریعہ اعزازی ممبری فیس قبول کر کے اس علمی کام میں ادارہ کی مدد کر سکتے ہیں



نعت سید عالم ﷺ

نعت

از: حجۃ الاسلام حضرت علامہ محمد حامد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ

گناہگاروں کا روز محشر شفیع خیر الانام ہو گا
دلہن شفاعت بنے گی ، دولہا نبی علیہ السلام ہو گا

کبھی تو چمکے گا نجم قسمت ، ہلال ماہ تمام ہو گا
کبھی تو ذرے پہ مہر ہو گی، کبھی وہ مہر ادھر خوش خرام ہو گا

پڑا ہوں میں ان کی رہ گزر میں پڑے ہی رہنے سے کام ہو گا
دل و جگر فرش رہ بنیں گے یہ دیدۂ عشق خرام ہو گا

انہیں کا منہ سب تکیں گے اس دن جو وہ کریں گے وہ کام ہو گا
دہائی سب ان کی دیتے ہوں گے انہیں کا ہر لب پہ نام ہو گا

ادھر وہ گرتوں کو تھام لیں گے ادھر پیاسوں کو جام دیں گے
صراط و میزان و حوض و کوثر یہیں وہ عالی مقام ہو گا

کہیں وہ جلتے بجھاتے ہوں گے کہیں وہ روتے ہنساتے ہوں گے
وہ پائے نازک پہ دوڑنا اور بعید ہر ایک مقام ہو گا

ہوئی جو مجرم کو باریابی تو خوف و عصیاں سے دھج یہ ہو گی
خمیدہ سر آب دیدہ آنکھیں لرزتا ہندی غلام ہو گا

حضور مرشد کھڑا رہوں گا کھڑے ہی رہنے سے کام ہو گا
نگاہ لطف و کرم اٹھے گی تو جھک کے میرا سلام ہو گا

خدا کی مرضی ہے ان کی مرضی، ہے ان کی مرضی خدا کی مرضی
انہیں کی مرضی پہ ہو رہا ہے انہیں کی مرضی پہ کام ہو گا

جدھر خدا ہے، ادھر نبی ہے، جدھر نبی ہے، ادھر خدا ہے
خدائی پھر سب ادھر پھرے گی جدھر وہ عالی مقام ہو گا

اسی تمنا میں دم پڑا ہے یہی سہارا ہے زندگی کا
بلا لو مجھ کو مدینہ سرور نہیں تو جینا حرام ہو گا

حضور روضہ ہوا جو حاضر تو اپنی سج دھج یہ ہو گی حامدؔ
خمیدہ سر آنکھ بند لب پر میرے درود و سلام ہو گا

منقبت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

از قلم: حضرت علامہ بدر القادری مصباحی رحمہ اللہ

زہے قسمت کہ لب پر ہے ثنا فاروق اعظم کی
امین حق ، ویزر مصطفی فاروق اعظم کی

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّار ان کی شان جبروتی
عدوئے دیں پہ ہیبت ہے سدا فاروق اعظم کی

مبارک عہد تھا ، عہد خلافت ذات والا کا
ستائش کوئی کر سکتا ہے کیا فاروق اعظم کی

حدیث پاک کے اوراقِ نورانی کوئی دیکھے
نبی نے مدح کی ہے جا بہ جا فاروق اعظم کی

منور سیرت ختم رسل سے زندگی ان کی
جہاں بھر سے نرالی ہے ادا فاروق اعظم کی

مشیر مصطفی ہیں راز دار دین فطرت ہیں
معین حق ہوئی فہم و ذکا فاروق اعظم کی

اگر بعد محمد مصطفیٰ کوئی نبی ہوتا
تو تھی وہ ایک ذات با صفا فاروق اعظم کی

عدو اللہ ، شیطانِ لعیں بھی ان سے ڈرتا تھا
لرزجاتا تھا جب سنتا صدا فاروق اعظم کی

مدد دی ساریہ کو مسجد نبوی کے منبر سے
مدینے سے کہاں پہنچی صدا فاروق اعظم کی

مٹائی رسم باطل مصر کی ، دریا کو خط لکھا
تو رودِ نیل نے کی اقتدا فاروق اعظم کی

انہیں مولا علی نے جانشین مصطفیٰ پایا
زمانہ کاش پہچانے ادا فاروق اعظم کی

رہا محروم مدحت خامۂ بدرؔ حزیں اب تک
خدا کا شکر کچھ کر لی ثنا فاروق اعظم کی



از:
حضرت علامہ شمیم احمد قادری
صاحب (ساؤتھ افریقہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس وقت میرے پیشِ نظر ماہنامہ الغوث (مئی) کا شمارہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس مبارک دینی و علمی مجلے کی عمدہ اشاعت پر سب سے پہلے میں اس کے سرپرست اعلیٰ حضرت علامہ و مولانا سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی چشتی قادری صاحب قبلہ، سجادہ نشین خانقاہ غوثیہ اصدقیہ سہسرام، کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، جن کی سرپرستی اور دعاؤں کے سائے میں یہ بابرکت رسالہ اپنی علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

اس سے قبل بھی اس ماہنامہ کے متعدد شمارے دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ہر شمارے میں شامل مضامین کے عناوین نہایت عمدہ، فکر انگیز اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ محسوس ہوئے۔ بالخصوص فقہی کالم میں جدید اور اہم مسائل کو مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو اہلِ علم اور عوام دونوں کے لیے نہایت مفید ہے۔ اسی طرح بچوں اور گوشۂ خواتین کے مستقل کالم بھی قابلِ ستائش ہیں۔

خصوصاً طلبۂ مدارس میں تحریری ذوق اور علمی بیداری پیدا کرنے کے لیے "جہانِ علم" کے عنوان سے موجود کالم نہایت لائق تحسین اور قابل تقلید اقدام ہے۔ یقین ہے کہ اس کے ذریعے نئی نسل کے طلبہ میں تحقیق، مطالعہ اور تحریر کا شوق پروان چڑھے گا اور ان کی علمی صلاحیتوں کو جِلا ملے گی۔

ماہنامہ الغوث اپنے دامن میں علمی، فکری، دینی اور تربیتی خوبیوں کو سمیٹے ہوئے ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کی مسلسل اور کامیاب اشاعت کا بڑا سہرا ادارالعلوم قادریہ غریب نواز کے صدر مفتی اور خانقاہ غوثیہ کے فرد فرید حضرت علامہ مولانا مفتی سید شہباز اصدق غوثی صاحب کے سر ہے۔ ایک معیاری ماہنامہ کی باقاعدہ اشاعت کوئی معمولی خدمت نہیں؛ ہر ماہ موضوعات کا انتخاب، اہل قلم سے رابطہ، مضامین کی فراہمی، ان کی ترتیب و تدوین، اداریہ کی نگارش، دینی مسائل کے کالم میں فتاویٰ کی تحریر اور اشاعت کے تمام مراحل نہایت محنت، اخلاص اور استقامت کا تقاضا کرتے ہیں۔

میں مفتی صاحب کو اس عظیم دینی و علمی خدمت پر قلبی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آخر میں اہلِ سنت اور بالخصوص علم دوست حضرات سے میری مخلصانہ گزارش ہے کہ اس ماہنامہ کا مطالعہ کریں۔ آپ کا مطالعہ اور علمی وابستگی ہی ایسی کاوشوں کی حقیقی قدر دانی اور بہترین داد ہے۔ اللہ تعالیٰ ماہنامہ الغوث کو قبول عام و خاص عطا فرمائے اور خانقاہ غوثیہ کے علمی و روحانی فیوض و برکات کو عام و تام فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

آپ کے تاثرات

از
محب گرامی جناب نبیل احمد صاحب
قونیہ، ترکیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ ''الغوث'' کا تازہ شمارہ نظرِ نواز ہوا۔ دل کو یہ دیکھ کر حقیقی مسرت ہوئی کہ اس دورِ اضطراب میں بھی ایسے علمی و ادبی مجلات اپنی تہذیبی ذمہ داری پوری وقار، حسنِ ترتیب اور فکری تازگی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

شمارے کی رنگین طباعت، جاذبِ نظر پیشکش اور اربابِ قلم کی سنجیدہ و معیاری تحریروں نے اسے محض ایک رسالہ نہیں بلکہ علم و فکر کی ایک مہذب نشست بنا دیا ہے؛ جہاں قاری کو ادب کی لطافت بھی ملتی ہے، شعور کی حرارت بھی، اور اہلِ دل کی خوشبو بھی۔ یہ بات بھی باعثِ اطمینان ہے کہ ''الغوث'' نے خشک علمی اسلوب کے بجائے دل آویز اور باوقار اندازِ پیشکش کو اختیار کر کے مطالعے میں ایک خاص تازگی پیدا کر دی ہے، جو آج کے قاری کی اہم ضرورت ہے۔

دعا ہے کہ یہ ادبی و فکری چراغ اسی طرح روشن رہے، اہلِ قلم کو ایک پاکیزہ پلیٹ فارم میسر آتا رہے، اور قارئین کے دل و دماغ علمِ نافع، فکرِ صالح اور ذوقِ سلیم سے منور ہوتے رہیں۔



معرکۂ کربلا: باطل کے خلاف حق کی آواز

مفتی سید شہباز اصدق

اداریہ

چند دنوں میں ماہ محرم الحرام کا چاند افق عالم پر طلوع ہونے والا ہے، یہ وہ چاند ہے جس کے نمودار ہوتے ہی کربلا کی تپتی ہوئی سرزمین پر اولاد رسول ﷺ کی طرف سے پیش کی جانے والی عظیم قربانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اللہ کی زمین پر بسنے والے بندگان خدا کے دل اس قربانی کو یاد کر کے فطری طور پر مغموم ہو جاتے ہیں۔ صبر و رضا، ایثار و وفا، استقامت و عزیمت اور تسلیم ورضا پر مشتمل یہ قربانی ایسی عظیم اور بارگاہ صمدیت میں ایسی مقبول ہے کہ اس کے وقوع کو چودہ صدیوں سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک اس کے تذکرے میں نہ کوئی فرق آیا ہے اور نہ ہی اس کے پیغام کی معنویت وافادیت میں کسی طرح کی کوئی کمی واقع ہوئی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 61 ہجری کی آتش خیز دوپہر میں دی جانے والی یہ عظیم قربانی کا پیغام ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ مزید اہمیت کا حامل ہوتا جارہا ہے۔

اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ کربلا کی سرزمین پر واقع ہونے والا یہ خونی معرکہ کسی اقتدار کی کشمکش، سلطنت کی ہوس اور جاہ و منصب کے حصول کی جدجہد نہ تھا بلکہ یہ قربانی ظلم و بربریت کے مقابل امن وعدل کی صدا، جور و ستم کے مقابل صبر ورضا کی آواز، کذب و دروغ کے مقابل حق و صداقت کی پکار، جبر و استبداد کے مقابل آزادی و حریت کی للکار، بے حیائی و منکرات کے مقابل امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عملی اعلان تھا۔ یہ باطل کے مقابل حق کی ایسی فیصلہ کن جنگ تھی جس میں اہل بیت رسول ﷺ نے رہتی دنیا تک کے لیے یہ پیغام عزیمت جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا کہ اہل حق کا سر کٹ تو سکتا ہے مگر باطل کے سامنے جھک نہیں سکتا، الغرض طاغوتی نظام کے خلاف یہ ایک ایسی عظیم الشان قربانی تھی جو صرف اس لیے ہوئی تا کہ رحمانی نظام کے نفاذ کے لیے فرزندان توحید کے سامنے ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دے اور یہ بتا دے کہ فرعون وقت کی بیعت سے انکار ہی در اصل عزیمت، مردانگی اور شجاعت و بہادری کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔

معرکۂ کربلا کا پہلا اور بنیادی درس یہ ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل کی راہ میں کسی قسم کی مداہنت کو راہ نہ دی جائے، بلکہ حق کی سربلندی کے لیے اپنی عزیز ترین متاع، اپنے اہل و عیال اور حتی کہ اپنی جان تک قربان کرنی پڑے تو وہ مسکراتے ہوئے قربان کردے۔ یزید کی تخت نشینی اسلامی تاریخ کا ایک ایسا نازک اور فیصلہ کن مرحلہ تھا جس نے اہلِ حق کو ایک عظیم آزمائش سے دوچار کر دیا۔ اس کے فسق و فجور، ظالمانہ طرز حکومت اور جابرانہ طرز فکر نے اسلام کی روح حریت، عدل اور شورائیت کو پامال کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اجماع امت اور اصول خلافت کو پس پشت ڈال کر محض قوت و جبر کے بل پر شخصی اقتدار کی بنیاد رکھنی چاہی۔ ایسے نازک موقع پر نواسۂ رسول، سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ حق کو نظر انداز کرکے باطل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ چنانچہ آپ نے پوری جرأت واستقامت کے ساتھ یزید کی اطاعت و بیعت سے انکار کیا۔ اگرچہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس معرکے میں اپنے اہل بیت، عزیز و اقارب اور جاں نثار رفقا کی قربانیاں پیش کیں، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک و پیاس سے تڑپتا دیکھا، پھر ان میں سے ہر ایک کو راہِ خدا میں قربان ہوتے ملاحظہ کیا، لیکن ان تمام جانگداز مصائب و آلام کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی اور نہ ہی آپ نے باطل کے ساتھ مصالحت یا سمجھوتے کا خیال دل میں آنے دیا۔ لاریب اگر آپ چاہتے تو حکومت کی وفاداری اور اطاعت کا عہد کر لیتے اور حق و صداقت سے روگردانی کے لیے مصلحت وقت کی تاویل کا سہارا لے سکتے تھے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ نظام الٰہی کو اپنی متاع عزیز اور خود اپنی جان پر ترجیح دی اور اس طرح احقاق حق کے لیے آپ نے اپنے رفقا اور بچوں کو قربان کرنے کے بعد خود بھی اپنے سر کا نذرانہ پیش کرکے جام شہادت نوش فرمایا اور اس طرح سیدنا امام حسین نے حق و صداقت، عدل و انصاف، استقامت و عزیمت اور وفاداری حق کی ہمیشہ کے لیے ایک کامل ترین مثال قائم کر دی کہ اطاعت و وفاداری کا ہاتھ صرف حق و صداقت کی طرف ہی بڑھ سکتا ہے۔ باطل کی اس سے کسی قسم کی کوئی یاری نہیں ہوتی۔

سید الشہداء سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی کا ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے صرف 72 رفقا کے ساتھ تاریخ کی یہ عظیم قربانی پیش کی۔ ظاہری اسباب و وسائل کے اعتبار سے نہ آپ کے پاس کوئی لشکر جرار تھا، نہ جنگی ساز و سامان کی فراوانی اور نہ ہی اقتدار و سلطنت کی پشت پناہی؛ لیکن اس کے باوجود آپ نے احقاق حق، ابطال باطل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا اور مصلحت اندیشی کے نام پر حق سے دست بردار ہونے کو قبول نہ فرمایا۔

واقعۂ کربلا کا یہ پہلو ہمیں یہ عظیم درس دیتا ہے کہ ظلم و باطل کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے مادی قوت، ظاہری وسائل اور دنیاوی شوکت و اقتدار ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ اہل حق کی اصل قوت ان کے ایمان، یقین، اخلاص اور استقامت میں مضمر ہوتی ہے۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کے حساب و کتاب اور نفع و نقصان کی مصلحتوں سے بے نیاز ہوتی ہے، کیونکہ نتائج کا

فیصلہ بندوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ربِّ قدیر کے دست قدرت میں ہوتا ہے۔ جو کمزور کو طاقتور پر فتح و نصرت سے ہمکنار کرتا ہے۔

آج امت مسلمہ ایک نہایت نازک اور آزمائش بھرے دور سے گزر رہی ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کو سیاسی، سماجی اور مذہبی چیلنجز کا سامنا ہے۔ کہیں ان کے مذہبی تشخص کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے، کہیں ان کی دینی اقدار کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور کہیں ان کے بنیادی انسانی حقوق پامال کیے جارہے ہیں۔ ہمارے اپنے وطن عزیز میں بھی اہل ایمان اور ان کے دینی شعار، مساجد، مدارس اور دیگر دینی ادارے مختلف قسم کے چیلنجز سے دوچار ہیں۔

ایسے حالات میں امت مسلمہ کے لیے واقعۂ کربلا محض تاریخ کا ایک المناک باب نہیں، بلکہ ایک زندہ، تابندہ اور ابدی پیغام ہے۔ آج بھی کربلا کی تپتی ہوئی ریت اور شہدائے کربلا کے خون سے رنگین ذرات امت کو بیداری، شعور اور خود احتسابی کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ ہمیں حق و صداقت کی سربلندی کے لیے سینہ سپر ہونے، ظلم و جبر کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے اور آزادی و حریت کی خاطر مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و عمل کا درس دے رہے ہیں۔ ریگ زار کربلا کا ایک ایک ذرہ آج بھی عدل و انصاف، حق و صداقت، صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور رضائے الٰہی کے انہی عظیم اصولوں کی طرف دعوت دے رہا ہے جن کے لیے 61 ہجری کی ایک آتش فشاں دوپہر میں فرزندانِ رسول ﷺ نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ گویا فضائے کربلا آج بھی اسی درد، اسی سوز اور اسی پیغام کے ساتھ انسانیت کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کاش! ہم اس پکار کو سن سکیں، اس پیغام کو سمجھ سکیں اور غم حسین کے اثرات کو محض آنسوؤں اور جذبات تک محدود رکھنے کے بجائے اپنے کردار، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی زندگی کا حصہ بنا سکیں۔ کاش! ہمارے دلوں میں حق شناسی کی تڑپ، صداقت کی حمایت کا جذبہ، عدل و انصاف کے قیام کی لگن اور باطل کے مقابلے میں استقامت و پامردی کی روح بیدار ہو جائے۔ کاش! ہم انتشار و افتراق کی زہر آلود فضا کو ختم کر کے اتحاد و اتفاق کی مضبوط بنیادوں پر اپنی ملت کی تعمیر کا عزم پیدا کر سکیں اور امت کے وقار، سربلندی اور قیادت کا احساس ہمارے دلوں میں از سرِ نو جاگزیں ہو جائے۔ یہی درحقیقت پیغامِ کربلا کا تقاضا اور شہدائے کربلا کی قربانیوں کا حقیقی ثمرہ ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر



درس قرآن

کائنات کی نہیں، خالق کائنات کی تعریف کرو

از: مولانا محمد حبیب اللہ بیگ ازہری، جامعہ اشرفیہ مبارک پور

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ وحدہ لاشریک کا ارشاد ہے: الَّذِيۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ ۰۰۳ ۔ [سورۂ ملک۳]

یعنی اللہ وہ ہے جس نے ایک کے اوپر ایک سات آسمان بنائے، تمھیں رحمٰن کی تخلیق میں کوئی خلل نظر نہیں آئے گا، نظر اٹھا کر دیکھو، آسمانوں میں تمھیں کوئی شگاف نظر آرہا ہے؟

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئیں، ایک یہ کہ اللہ نے طبق در طبق سات آسمان بنائے، جس کا ذکر آیت کے ابتدائی جز "الَّذِيۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا" میں ہے۔

دوسرے یہ کہ ان آسمانوں میں کہیں شگاف یا عدم توازن نہیں ہے، جس کا ذکر آیت کے درمیانی اور آخری جز" مَا تَرٰى فِيۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ" میں ہے۔

عربی زبان کا ایک عام اسلوب یہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر پہلی بار ہوتا ہے تو اس کے لیے اسم ظاہر ذکر کیا جاتا ہے، دوبارہ اسی اسم یا اس سے متعلق کسی چیز کا ذکر کرنا ہو تو اس کے لیے عموماً ضمیر کا استعمال کیا جاتا ہے، لیکن پیش نظر آیت مبارکہ کا اسلوب عام استعمالات سے مختلف ہے، کیوں کہ اس آیت میں پہلے سات آسمانوں کا ذکر ہوا، جس کے لیے اسم ظاہر سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ذکر کیا گیا، پھر انھی آسمانوں میں عدم توازن یا شگاف نہ ہونے کا ذکر کیا گیا، جس کے لیے نہ ضمیر لائی گئی نہ اسم ظاہر کا ذکر کیا گیا، بلکہ فرمایا: مَا تَرٰى فِيۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ

اس آیت مبارکہ میں سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ کے بعد ماتری فیھن کے بجائے مَا تَرٰى فِيۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ کہہ کر ایک خاص نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ کسی بھی شے پر غور کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ کسی شے پر بحیثیت شے غور کیا جائے، یعنی اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر کے شے میں پوشیدہ محاسن و کمالات تک رسائی حاصل کی جائے، اور اسی ادراک و معرفت کو اپنی تحقیق کی انتہا اور اصل کامیابی تصور کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ کسی شے پر بحیثیت مخلوق غور کیا جائے، یعنی شے کا بغور مطالعہ کر کے اس میں پوشیدہ اسرار و محاسن کو تلاش کیا جائے، پھر ان محاسن و کمالات کے ذریعے خالق کے وجود، اس کی بے مثال قدرت اور اس کے حسن تخلیق پر دلیل لائی جائے، اس طرح شے کے بجائے اس کے خالق تک رسائی کو اپنے مطالعہ و تحقیق کا مقصود تصور کیا جائے۔

جو لوگ کسی بھی شے کا بحیثیت شے مطالعہ کرتے ہیں وہ اسی شے تک محدود رہ جاتے ہیں، شے کی معرفت انھیں خدا کے وجود اور اس کی قدرت کا معترف نہیں بناتی، سائنس دانوں نے کائنات میں پھیلی ہزاروں چیزوں کی حقیقت دریافت کر لی، لیکن انھیں خدا کی معرفت حاصل نہ ہو سکی، کیوں کہ انھوں نے کائنات کا بحیثیت مخلوق مطالعہ نہیں کیا، اگر یہ حضرات کائنات میں پھیلی نشانیوں کے اسرار و محاسن کے ساتھ ساتھ ان کے خالق و مصور کی تلاش جاری رکھتے تو ضرور حق آشنا ہو جاتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اسی لیے قرآن کریم نے کسی بھی شے کا بحیثیت مخلوق مطالعہ کرنے کا حکم دیا، جس کی واضح نظیر پیش نظر آیت ہے، جس میں پہلے آسمانوں کا ذکر کیا، پھر ان آسمانوں کو اللہ کی بے مثال تخلیق کا خوب صورت مظہر قرار دیا، اور فرمایا کہ یہ رحمٰن کی تخلیق ہے، دیکھو تمھارے مہربان رب نے ان آسمانوں کو کس طرح بلند، مضبوط اور بے عیب بنایا، کیا تمھیں تمھارے مہربان رب کی اس خوب صورت تخلیق میں کوئی عیب نظر آتا ہے؟ کہیں کوئی عدم توازن یا شگاف نظر آتا ہے؟ اور اگر نظر نہیں آتا، تو یہ ان آسمانوں کا کمال نہیں، بلکہ خلاق اکبر کا کمال ہے جس نے انھیں بغیر ستونوں کے بلند کیا اور ان میں کہیں کوئی شگاف نہیں رکھا۔ جو لوگ مظاہر فطرت پر غور کرتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آ سکتی، وہ اس وسیع کائنات کے پس پردہ کار فرما لامتناہی قدرتوں پر یقین کر لیتے ہیں، اور بزبان حال کہتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ [سورۂ آل عمران ۱۹۱]

مولیٰ! تو ہی اس جہان رنگ و بو کا خالق ہے، تو نے یہ جہان عبث اور بے کار نہیں بنایا، تو ہر طرح کے عبث سے پاک ہے، کائنات میں پھیلی نشانیاں دکھا کر اپنی معرفت عطا فرمانے والے پروردگار! ہمیں دوزخ کی آگ سے محفوظ فرما۔

بلاشبہ یہ وسیع و عریض کائنات اللہ کی واضح نشانی اور اس کی غالب قدرتوں کا مظہر ہے، یہ کائنات متلاشیان حق کے لیے کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے، جو لوگ اس کے روشن صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں، اور سنجیدگی سے تدبر کرتے ہیں، وہ خالق کائنات کے وجود و حیات، اس کے علم و قدرت، اور اس کے تصرفات و اختیارات کے معترف ہو جاتے ہیں، یہی مطالعہ کائنات کا اصل مقصد ہے۔



انوار حدیث

ایمان کی مٹھاس

از: حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی صاحب رحمہ اللہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ثَلٰثٌ مَنۡ کُنَّ فِیۡہِ وَجَدَ حَلَاوَۃَ الۡاِیۡمَانِ اَنۡ یَّکُوۡنَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ اَحَبَّ اِلَیۡہِ مِمَّا سِوَاھُمَا وَاَنۡ یُّحِبَّ الۡمَرۡءَ لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ وَاَنۡ یَّکۡرَہَ اَنۡ یَّعُوۡدَ فِی الۡکُفۡرِ کَمَا یَکۡرَہُ اَنۡ یُّقۡذَفَ فِی النَّارِ (1)

(بخاری، ج ا، کتاب الایمان، ص ۷)

ترجمہ: حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں جس شخص میں ہوں وہ ایمان کی مٹھاس پائے گا {ا} جس کو اللہ و رسول ان دونوں کے ماسوا (سارے جہان) سے زیادہ محبوب ہوں۔ {۲} اور جو کسی آدمی سے خاص اللہ ہی کے لیے محبت رکھتا ہو {۳} اور جو اسلام قبول کرنے کے بعد پھر کفر میں جانے کو اتنا ہی بُرا جانے جتنا آگ میں جھونک دیئے جانے کو بُرا جانتا ہے۔

شرحِ حدیث: اس حدیث کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جس طرح ”شکر“ اور چیز ہے اور ”شکر کی مٹھاس“ اور چیز ہے اسی طرح ایمان اور چیز ہے اور ایمان کی لذت اور چیز ہے۔ جس شخص کے منہ کا ذائقہ بالکل درست ہو اگر وہ شکر کھائے گا تو اس کو شکر کی مٹھاس کا لُطف و مزہ بھی محسوس ہو گا لیکن اگر کوئی صَفراوی بخار کا مریض جس کے منہ کا ذائقہ بگڑ کر تلخ ہو چکا ہو اگر وہ شکر کھائے گا تو اس کو شکر کی مٹھاس محسوس نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ پہلا شخص تو شکر کھانے والا بھی کہلائے گا اور شکر کی لذت پانے والا بھی ہو گا اور دوسرا شخص اگرچہ شکر کھانے والا تو کہلائے گا مگر شکر کی مٹھاس کی لذت سے محروم ہو گا۔

بس بالکل یہی مثال ایمان کی ہے جو شخص کلمہ پڑھ کر مومن ہو گیا اور ایمان کے بعد اس میں تین خَصلَتیں پیدا ہو گئیں تو وہ شخص ایمان کی مٹھاس یعنی ایمانی لذت کا لُطف و مزہ بھی پالے گا اور جس شخص میں یہ تینوں خصلتیں نہیں پیدا ہوئیں تو وہ شخص اگرچہ صاحب ایمان تو ہو گا مگر ایمان کی مٹھاس یعنی ایمان کی لذت خاص کے لطف و مزہ سے مَحروم رہے گا۔

وہ تین چیزیں جن پر ایمان کی مٹھاس اور لذت کا پایا جانا مَوقوف ہے وہ کون کون ہیں اب ان کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے اور

انتہائی جذبۂ اخلاص کے ساتھ انتہائی جدوجہد اور پوری پوری کوشش کیجیے کہ آپ میں یہ تینوں خصلتیں پیدا ہو جائیں تا کہ آپ ایمان کی مٹھاس یعنی ایمان کی لذتِ خاص سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اللہ ورسول کی محبت: اللہ ورسول عزوجل وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا سارے عالَم سے بڑھ کر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مومن کے دل کی گہرائیوں میں اللہ ورسول کی محبت اس طرح گھر کر جائے اور اس قدر مضبوط و مستحکم ہو جائیں کہ اپنے آباء و اَجداد، اَزواج و اَولاد، مکان ودکان، مال وسامان، جسم وجان یہاں تک کہ سارے جہان کو اللہ ورسول کی راہ میں قربان کر دینے کا سچا جذبہ پیدا ہو جائیں۔

علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری میں ایسی استقامت اور اوامر ونواہی کی تعمیل میں ایسا اِلتِزام ہو کہ کسی حال میں بھی جذبۂ استقامت اور جوشِ اِلتِزام مُتَزَلزل نہ ہو۔ (2)

حُبٌّ فی اللہ: صوفیاء کرام نے فرمایا ہے کہ "حب فی اللہ" اور "بغض فی اللہ" یعنی اللہ ہی کے لیے دوستی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی یہ تَصَوُّف کی جان ہے۔ ایک مومن کے کامل ایمان کی یہ ایک بہت بڑی نشانی ہے کہ وہ اگر کسی سے دوستی کرتا ہے تو اپنی کسی غرضِ نفسانی کے لیے نہیں بلکہ خالص رضائے الٰہی کے لیے دوستی کرتا ہے اور اگر وہ کسی سے دشمنی رکھتا ہے تو محض اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے دشمنی رکھتا ہے۔ مثلاً ہم لوگ انبیاء، صِدِّیقین، شہدا اور صالحین سے جو محبت رکھتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ یہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں یا یہ لوگ ہماری مالی امداد کر چکے ہیں بلکہ صرف اس لیے ہم ان حضرات سے محبت کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے محبوب بندے ہیں۔

اور اگر ہم ابوجہل، ابولہب اور دوسرے کافروں یا منافقوں یا بد مذہبوں سے بغض رکھتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان لوگوں نے ہم لوگوں کو مارا پیٹا ہے یا ہم لوگوں کا مال واسباب لوٹ لیا بلکہ ہم ان ظالموں سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کے دشمن ہیں۔

اللہ ہی کے لیے دوستی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی، اسی کا دوسرا نام اِخلاص ہے۔ مومن کے لیے ہر عمل میں اخلاص و لِلّٰہیت کا جذبہ رکھنا یہ ایمان کی لذت پالینے کی دوسری شرط ہے اور یاد رکھیے کہ مومن کے جذبۂ اِخلاص کی وہ طاقت ہے کہ اس کی روحانی توانائیوں کے مقابلہ میں ہزاروں شیطانوں کی طاغوتی طاقتیں لرزہ براَندام رہتی ہیں۔ شیطان خود ہی خدا کے دربار سے یہ کہہ کر نکلا ہے کہ "اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ" (3)

یعنی اے اللہ! میں قیامت تک اولادِ آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا مگر تیرے اخلاص والے بندوں پر میرا جادو نہیں چل سکے گا۔

حکایت: اللہ اکبر! اِخلاص کی طاقت کا کیا کہنا! بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ایک عابد کو پتہ چلا کہ فلاں جنگل میں ایک درخت کو لوگ

پوجتے ہیں، عابد کو لوگوں کے اس شرک پر بڑا جلال اور بے حد غصہ آگیا۔ عابد نے ایک کلہاڑی لی اور یہ عزم کر کے چل پڑا کہ میں اس درخت کو جڑ سے کاٹ کر اس شرک کی جڑ ہی کاٹ دوں گا۔ مگر ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ شیطان ایک پہلوان کی شکل میں سامنے آگیا اور کہنے لگا کہ کہاں چلے؟ عابد نے کہا کہ میں جنگل میں فلاں درخت کو کاٹنے کے لیے جارہا ہوں۔ شیطان نے کہا کہ میں اُس درخت کا نگہبان ہوں بھلا تمہاری مَجال ہے کہ تم اس درخت کو کاٹ سکو گے۔ عابد جوش میں شیطان سے لڑ پڑا اور شیطان کو زمین پر پچھاڑ کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور شیطان بالکل ہی عاجز ولاچار ہوگیا۔ جب شیطان ہار گیا تو عابد سے کہنے لگا: بھائی! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں تم اس درخت کو مت کاٹو، اس درخت کے کاٹنے سے تم کو کیا فایدہ ہوگا خواہ مخواہ تھک جاؤگے اور رات کو نمازِ تہجد بھی نہ پڑھ سکو گے، تم اس درخت کو کاٹنے کے خیال سے باز آجاؤ میں اس کے بدلے میں روزانہ تم کو ایک اشرفی دیا کروں گا، خود بھی آرام سے کھانا پینا اور اس میں سے فقراء اور مساکین کو صدقہ بھی دیتے رہنا اور انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہنا۔ عابد پر شیطان کا جادو چل گیا اور روزانہ ایک اشرفی کا نام سن کر اُس پر لالچ کا بھوت سوار ہوگیا۔ عابد نے وعدہ کر لیا کہ جاؤ میں اب اس درخت کو نہیں کاٹوں گا۔ چنانچہ چند دنوں تک تو شیطان عابد کے پاس روزانہ ایک اشرفی پہنچاتا رہا لیکن پھر ایک دم بند کر دیا۔ جب کئی دنوں تک اشرفی نہیں آئی تو عابد کو بڑا غصہ آیا کہ کم بخت شیطان نے مجھے دھوکہ دیا، پھر کلہاڑی اٹھائی کہ چل کر درخت کاٹ ڈالوں۔ چنانچہ گھر میں سے نکلا ہی تھا کہ شیطان بصورتِ پہلوان سامنے آگیا اور راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ اور عابد سے کہنے لگا کہ خبردار! تم اس درخت کو کبھی ہرگز ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔ عابد نے تڑپ کر کہا کہ میں ضرور کاٹوں گا یہاں تک کہ دونوں گُتھم گُتھا ہوگئے مگر اب کی مرتبہ شیطان نے اس زور سے عابد کو زمین پر دے مارا کہ عابد کا سارا اَنجر پَنجر ڈھیلا ہوگیا اور شیطان عابد کے سینے پر سوار ہوگیا۔ عابد لاچار ہو کر کہنے لگا کہ یار! میں سمجھ نہیں سکا کہ پہلے دن تو میں نے بہت ہی معمولی زور لگا کر تمہیں پچھاڑ دیا تھا مگر آج میں اپنی پوری طاقت لگانے کے باوجود تمہاری پیٹھ نہیں لگا سکا بلکہ خود ہی چت ہوگیا آخر معاملہ کیا ہے؟ اُس وقت شیطان نے کہا کہ میاں جی! ہوش کی دوا کرو۔ پہلی مرتبہ جو تم درخت کاٹنے چلے تھے تو صرف خدا کی رضاجوئی اور اخلاص کی نیت لے کر چلے تھے اس لیے میں تم پر قابو نہیں پاسکا تھا کیونکہ میں ہمیشہ خدا کے مخلص بندوں ہی سے عاجز ولاچار رہتا ہوں۔ مگر اب کی مرتبہ تم اخلاص کے ساتھ درخت کاٹنے کے لیے نہیں چلے تھے بلکہ اس غصہ میں چلے تھے کہ تم کو میں نے اشرفی نہیں دی تھی۔ سن لو! جب تک تمہارے اندر اخلاص کی طاقت کارفرما تھی میں تم سے عاجز تھا اب جبکہ اخلاص کی طاقت سے تم محروم ہوگئے تو اب قیامت تک تم مجھ پر کبھی غلبہ نہیں پاسکو گے۔(4)

کفر آگ میں جانے کے برابر: تیسری چیز جس پر ایمان کی لذت و حلاوت کا پایا جانا موقوف ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کفر سے اتنا ہی بیزار اور مُتَنَفِّر ہو جتنا کہ آگ کے شعلوں میں ڈالے جانے سے بیزار و مُتَنَفِّر رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی انسان

کبھی کسی حالت میں بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کو جلتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جھونک دے اسی طرح کسی حالت میں بھی ایک سچا مومن کفر کرنے کو کبھی ہر گز ہر گز گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ کفر کرنا اور آگ میں داخل ہونا دونوں اس کے نزدیک برابر ہوں۔ جب کسی مومن کو کفر سے اتنی نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائیں تو اس کو حلاوتِ ایمان کا مزہ نصیب ہو جائیں گا۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو حلاوتِ ایمان کی لذت سے لطف اندوز فرمائیے (آمین)

فوائد و مسائل: {۱} یہ حدیث مسلم شریف، ترمذی شریف، نساء شریف میں بھی مذکور ہے۔ {۲} اگر کسی مسلمان کو کافروں نے کفر کرنے پر اس طرح مجبور کر دیا کہ اس کو اپنی جان کا خطرہ یقینی طور پر نظر آنے لگا تو اگرچہ قرآن کے حکم اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَ قَلۡبُهٗ مُطۡمَٮِٕنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ (1) سے اس مسلمان کے لیے یہ رخصت ہے کہ وہ کفر کی بات زبان سے کہہ دے بشر طیکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمین ہو لیکن اگر وہ مسلمان اس حالت میں بھی کفر کی بات زبان پر نہ لائے اور جان دے دے تو بلا شبہ وہ بہت ہی افضل و اعلیٰ درجے کی شہادت سے سر فراز ہو گا۔ چنانچہ صحابہ کرام اور بہت سے شہدائے اسلام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی اسوۂ حسنہ ہے کہ ان خاصان خُدا کو جب کافروں نے کفر کرنے پر مجبور کر دیا اور ان کی گردنوں پر تلواریں رکھ دیں تو ان حضرات نے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر کفر کی بات اپنی زبانوں پر نہیں لائے بلکہ دینِ اسلام پر استقامت کا پہاڑ بنے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ اور اپنی زندگی کی آخری سانس خدا کی راہ میں قربان کر کے شہادت کے اِعزاز سے سر فراز ہو گئے۔

سبحان اللہ ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حوالہ

1… صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان، الحدیث:۱۶

2… الشفاء بتعریف حقوق المصطفٰی، الجزء الثانی، القسم الثانی، الباب الثانی فی لزوم محبتہ، ص ۲۴، ماخوذاً

3… ترجمہ کنز الایمان: مگر جو اُن میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ (پ ۲۳، آیت 106)

4… احیاء علوم الدین، کتاب النیۃ والاخلاص والصدق، ج ۵، ص ۱۰۵، ۱۰۴



از: سیدنا امام غزالی رضی اللہ عنہ

درس تصوف

زبان کی حفاظت

بے شک زبان اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت اور اس کی بنائی ہوئی عجیب و غریب اور لطیف اشیاء میں سے ایک شے ہے، اس کا سائز چھوٹا لیکن اس کی اطاعت اور نافرمانی بڑی ہے اس لئے کہ کفر و ایمان کا ظُہُور محض زبان کی شہادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اِیمان اِطاعت کا اور کُفر نافرمانی کا انتہائی درجہ ہے۔ ہر چیز خواہ وہ موجود ہو یا معدوم، خالق ہو یا مخلوق، خیالی ہو یا معلوم، ظنی ہو یا وہمی، ان سب کا تعلق زبان سے ہے۔ زبان ان کو ثابت کرتی ہے یا ان کی نفی کرتی ہے۔ حق ہو یا باطل جس شے کو بھی علم شامل ہو زبان اسے بیان کرتی ہے اور علم ہر شے کو شامل ہے۔ یہ ایسی خاصیت ہے جو دیگر اعضاء میں نہیں پائی جاتی کیونکہ آنکھ کی رسائی رنگوں اور صورتوں کے علاوہ کسی تک نہیں جبکہ کان آواز کے علاوہ کچھ نہیں سن سکتے اور ہاتھ کی پہنچ اجسام کے علاوہ کسی تک نہیں۔ اسی طرح دیگر اعضاء کا معاملہ ہے جبکہ زبان کا میدان وسیع ہے اس کے لئے نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ کوئی حد وانتہا۔ نیکی و بھلائی میں اس کا میدان وسیع ہے اور شر میں اس کا دامن لمبا ہے لہذا جو اپنی زبان کو کھلی آزادی دے دیتا ہے اور اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے تو شیطان اس کو ہر میدان میں داخل کر دیتا ہے اور گرنے کے قریب گڑھے کے کنارے لے جاتا ہے حتی کہ اسے ابدی ہلاکت پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ زبان ہی لوگوں کو فضول گفتگو کے سبب جہنم میں منہ کے بل گراتی ہے۔ زبان کے شر سے وہی نجات پا سکتا ہے جو اسے شریعت کی لگام دے کر قابو کرے اور اسے ان چیزوں میں استعمال کرے جو اسے دنیا و آخرت میں نفع دیں اور اسے ہر اس چیز سے روکے جس کے فتنے و مصیبت کا دنیا و آخرت میں خوف ہو۔ کس جگہ زبان کو استعمال کرنا اچھا ہے اور کہاں برا ہے، اس بات کا علم مخفی اور پیچیدہ ہے اور جو اس بات کو پہچان لے اس کے لئے اس پر عمل مشکل اور دُشوار ہے۔ انسان کے اَعضاء میں جس عضو سے سب سے زیادہ گناہ سرزد ہوتے ہیں وہ زبان ہی ہے کیونکہ اس کو استعمال کرنے اور اسے حرکت دینے میں کوئی مشقت و تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی اور لوگ اس کی آفات اور فتنے و فسادات سے بچنے اور اس کے جالوں اور پھندوں سے محتاط رہنے کے معاملے میں سستی سے کام لیتے ہیں حالانکہ انسان کو بہکانے میں یہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

زبان کا خطرہ بہت بڑا ہے اور اس کے خطرے سے نجات صرف خاموشی میں ہے اسی وجہ سے شریعت نے خاموشی کی تعریف

بیان کی ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے

﴿1﴾...مَنْ صَمَتَ نَجَا یعنی جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ (سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة، ۴/ ۲۲۵، حدیث: ۲۵۰۹)

﴿2﴾...اَلصَّمْتُ حُکْمٌ وَّقَلِیْلٌ فَاعِلُه ،یعنی خاموشی حکمت ہے مگر اس کو اختیار کرنے والے تھوڑے ہیں۔

(شعب الایمان، باب فی حفظ اللسان، ۴/ ۲۶۴، حدیث: ۵۰۲۷)

﴿3﴾... حضرت سیِّدُنا عبد اللہ بن سفیان اپنے والد سے رِوایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے بار گاہِ رسالت میں عرض کی: یا رسولَ اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ! مجھے اسلام سے متعلق کسی ایسی بات کی خبر دیجئے جس کے بارے میں آپ کے بعد میں کسی سے نہ پوچھوں؟ ارشاد فرمایا: ”یہ کہو میں ایمان لایا پھر اس پر قائم رہو۔ “میں نے عرض کی: میں کس چیز سے ڈروں؟ تو آپ نے اپنے ہاتھ مُبارَک سے اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا۔ (سنن الترمذی، باب ماجاء فی حفظ اللسان، ۴/ ۱۸۴، حدیث: ۲۴۱۸)

﴿4﴾... حضرت سیِّدُنا عُقْبہ بن عامر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہ فرماتے ہیں: میں نے بار گاہِ رسالت میں عرض کی: یا رسولَ اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم! نجات کیا ہے؟ فرمایا: اپنی زبان کی حفاظت کرو، تمہارا گھر تمہیں کفایت کرے اور اپنے گناہوں پر آنسو بہاؤ۔

(سنن الترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی حفظ اللسان، ۴/ ۱۸۴، حدیث: ۲۴۱۴)

﴿5﴾...مَنْ یَتَکَفَّلَ لِیْ بِمَا بَیْنَ لِحْیَیْہِ وَرِجْلَیْہِ اَتَکَفَّلُ لَہٗ بِالْجَنَّۃ یعنی جو مجھے دونوں جبڑوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان والی چیز (یعنی زبان اور شرم گاہ) کی حفاظت کی ضمانت دے میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

(سنن الترمذی، کتاب الزھد، باب فی حفظ اللسان، ۴/ ۱۸۲، حدیث: ۲۴۱۶)

ایک سوال اور اس کا جواب:

خاموشی کی اتنی بڑی فضیلت کس وجہ سے ہے؟

جواب: بولنے میں کثیر آفات ہیں غَلَطی، جُھوٹ، غیبت، چُغلی، رِیاکاری، نِفاق، فُحش گوئی، بحث ومُباحثہ کرنا، اپنی تعریف کرنا، باطِل میں مشغول ہونا، جھگڑا کرنا، فضول گفتگو کرنا، بات بڑھانا گھٹانا، مخلوق کو ایذا دینا اور کسی کی پردہ دری کرنے جیسے عُیوب کا تعلق زبان ہی سے ہے۔ یہ کثیر آفات زبان پر بہت جلد آجاتی ہیں اور زبان پر بوجھ بھی نہیں بنتیں اور دل کو ان کی وجہ سے لُطف وسُرُور حاصل ہوتا ہے، خود طبیعت بھی ان پر اکساتی ہے اور شیطان بھی زور لگاتا ہے۔ ان آفات میں پڑنے والا زبان کی حفاظت کرنے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ وہ اپنی من پسند بات کر گزرتا ہے اور جو خود کو ناپسند ہو اس سے خاموش رہتا ہے جبکہ یہ (یعنی کہاں بولنا اچھا ہے اور کہاں برا) مخفی اور پیچیدہ علم میں سے ہے، لہٰذا بولنے میں خطرہ ہے اور چپ رہنے میں عافیت ہے یہی وجہ ہے کہ خاموشی کی بڑی فضیلت ہے۔ نیز خاموش رہنے سے مُنْتَشِر خیالات واَفکار یکجا ہو جاتے ہیں، وقار قائم رہتا

ہے، بندہ ذکر وفکر اور عبادت کے لئے فارغ ہو تا ہے، دنیا میں بولنے کے برے انجام سے امن میں اور آخرت میں اس کے حساب سے فارغ رہتا ہے۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ (پ۲۶، ق: ۱۸)
ترجمہ: کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو۔

کلام کی اقسام:

خاموشی کے ضروری ہونے پر ایک امر رہنمائی کرے گا اور وہ یہ ہے کہ کلام چار قسموں پر مشتمل ہے: (۱)... خالص نقصان دہ۔ (۲)... خالص مفید۔ (۳)... نقصان دہ بھی اور مفید بھی۔ (۴)... نہ نقصان دہ اور نہ مفید۔

جو خالص نقصان دہ ہے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے اور جو نقصان دہ بھی ہے اور مفید بھی لیکن اس کا فائدہ و نفع، نقصان کے برابر نہیں ہے (بلکہ کم ہے) اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔ جو نہ نقصان دہ ہے اور نہ مفید تو یہ فضول کلام ہے اس میں مشغول ہونا وقت کو ضائع کرنا ہے اور یہ بڑا خسارہ اور نقصان ہے۔ اب صرف چوتھی قسم باقی رہ جاتی ہے تو کلام کا تین چوتھائی حصہ ساقط ہو گیا اور ایک چوتھائی رہ گیا اور اس چوتھائی حصے میں بھی خطرہ ہے کیونکہ خالص مفید گفتگو میں بھی گناہ مثلاً پوشیدہ ریاکاری، دکھلاوا، غیبت، اپنی تعریف چاہنا اور فضول کلام شامل ہو جاتے ہیں اور یہ شمولیت ایسی ہوتی ہے (کہ اکثر لوگوں کے لئے) جسے جاننا مشکل ہوتا ہے لہذا انسان خطرے میں ہے اور جو شخص زبان کی آفات کی باریکیوں کو جان لے گا تو وہ لازماً یہ بھی جان لے گا کہ **اللہ** کے محبوب، دانائے غیوب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے جو ارشاد فرمایا وہ قول فیصل ہے۔ چنانچہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: "جو چپ رہا اس نے نجات پائی" آپ ﷺ کو بالیقین حکمتوں کے جواہر اور جامع کلمات عطا کئے گئے ہیں۔ (احیاء العلوم)



پب جی گیم کھیلنے کا شرعی حکم

مفتی سید شہباز اصدق غوثی

سوال: کھیل مثلا کرکٹ، ساکر وغیرہ کھیلنا کیسا ہے اور کھیل سے متعلق شرعی حکم بتادیں نیز یہ بھی واضح فرمادیں کہ پب جی گیم جو بچے موبائل پر کھیلتے ہیں اس کا کیا حکم ہے ؟۔ محمد طاہر حسین اصدقی، اڈیشہ

بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اَلۡجَوَابُ بِعَوۡنِ الۡمَلِکِ الۡوَھَّابِ

لہو ولعب شرعِ شریف کی رو سے ناجائز ہے، کیونکہ کھیل ایک لغو ولایعنی کام ہے اور بندہ لغو ولایعنی کام کے لیے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد بہت عظیم ہے۔ لہٰذا بندگانِ خدا کو لہو ولعب اور کھیل کود سے خود کو باز رکھنے کا حکم ہے۔ تاہم تین کھیل کی صاحب شریعت، سیدنا رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اجازت حاصل ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

عَنۡ أَبِي هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «كُلُّ شَيۡءٍ مِنۡ لَهۡوِ الدُّنۡيَا بَاطِلٌ إِلَّا ثَلَاثَةٌ، انۡتِضَالُكَ بِقَوۡسِكَ، وَتَأۡدِيبُكَ فَرَسَكَ، وَمُلَاعَبَتُكَ أَهۡلَكَ، فَإِنَّهَا مِنَ الۡحَقِّ»

جتنی چیزوں سے آدمی لہو کرتا ہے سب باطل ہیں مگر کمان سے تیر چلانا اور گھوڑے کو ادب دینا اور زوجہ کے ساتھ ملاعبت کہ یہ تینوں حق ہیں۔(المستدرک، کتاب الجهاد، الحدیث 2468)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اسی طرح لہو ولعب کی جتنی قسمیں ہیں سب باطل ہیں صرف تین قسم کے لہو کی حدیث میں اجازت ہے، بی بی سے ملاعبت اور گھوڑے کی سواری اور تیر اندازی کرنا"(بہار شریعت، ج3 ص511)

جن تین کھیلوں کی اجازت حدیث میں مذکور ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تینوں بظاہر کھیل ہیں، مگر حقیقت میں یہ اپنے اندر بڑی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ مثلاً بیوی کے ساتھ تفریح، نسلِ انسانی کے وجود اور افزائشِ نسل کا ذریعہ ہے، اسی طرح گھوڑے کو سدھانا اور تیر اندازی نسلِ انسانی کے تحفظ و بقا کا ذریعہ ہیں۔ تو اگر کوئی کھیل ایسا ہو کہ نام کا کھیل ہو لیکن اس سے مقصود اہم حکمت و مصلحت ہوں تو پھر اس کھیل کی شریعت میں اجازت ہو گی۔ لیکن اس میں بھی درجِ ذیل چند شرطوں کا خیال لازمی ہو گا: اس کے کھیلنے سے کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ ہوتا ہو۔ جسمانی ورزش اور حفظانِ صحت کی نیت سے کھیلا جائے۔ مقابلہ و معاوضہ و تفاخر کے طور پر نہ ہو کہ اس میں ہار جیت ہو اور کھیلنے والوں کو کچھ معاوضہ یا انعام دینا مشروط یا عرفاً معروف ہو۔ کوئی عبادت ضائع نہ ہوتی ہو۔ ان شرائط کی رعایت کی جائے تو پھر کھیلنے کی اجازت ہو گی۔ ردّ المحتار کے درجِ ذیل جزئیہ سے اس کا ثبوت ہوتا ہے۔

فی الجواهر: قد جاء الاثر فی رخصته المصارعة لتحصیل القدرة دون التلهّی فانه مکروه اه والظاهر ان یقال مثل ذٰلك فی تادیب الفرس والمناضلة بالقوس اه۔ (ردالمحتار کتاب الحظر والاباحة / فصل فی البیع، دار احیاء التراث العربی بیروت ۵/ ۲۵۳ و ۲۵۸)

"آثار میں کشتی (پہلوانی) کی اجازت اس صورت میں وارد ہوئی ہے جب اس کا مقصد قوت و طاقت حاصل کرنا ہو، نہ کہ محض کھیل تماشا اور دل لگی۔ اگر صرف تفریح اور لہو و لعب مقصود ہو تو یہ مکروہ ہے۔"

بہار شریعت میں صدر الشریعہ علامہ امجدی علی اعظمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"کشتی لڑنا اگر لہو و لعب کے طور پر نہ ہو بلکہ اس لیے ہو کہ جسم میں قوت آئے اور کفار سے لڑنے میں کام دے، یہ جائز و مستحسن و کار ثواب ہے بشرطیکہ ستر پوشی کے ساتھ ہو۔ (بہار شریعت، ج3 ص512)

مذکورہ ارشادات فقہا سے معلوم ہوا کہ کھیل سے مقصود جب کوئی اہم مصلحت ہو اور اس کے کھیلنے سے کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ ہوتا ہو تو وہ کھیل شرعاً جائز ہو گا۔

اب ہم ذیل میں کتب حدیث سے چند ایسی روایات درج کر رہے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گھوڑ سواری کا مقابلہ کرایا اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود بہ نفس نفیس دوڑ کے مقابلہ میں حصہ لیا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَابَقَ بَيْنَ الخَيْلِ الَّتِي أُضْمِرَتْ مِنَ الحَفْيَاءِ، وَأَمَدُهَا ثَنِيَّةُ الوَدَاعِ، وَسَابَقَ بَيْنَ الخَيْلِ الَّتِي لَمْ تُضْمَرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ»، وَأَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ فِيمَنْ سَابَقَ بِهَا (صحیح البخاری، بَابٌ: هَلْ يُقَالُ مَسْجِدُ بَنِي فُلاَنٍ؟، الحدیث 420)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اضمار شدہ گھوڑوں کا (وہ گھوڑے جن کو پہلے خوب کھلایا پلایا جائے پھر انہیں بھوکا رکھ کر ان کا پسینہ نکلوایا جائے) حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک کے مقابلہ میں خود حصہ لیا اور غیر اضمار شدہ گھوڑوں کا ثنیہ سے لے کر مسجد بنو زریق تک مقابلہ میں حصہ لیا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی مقابلہ کرنے والے صحابہ میں تھے۔(صحیح البخاری)۔یعنی ان دونوں مقابلوں میں سرکار صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خود شرکت فرمائی۔

سنن ابو داؤد کی روایت ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّهَا كَانَتْ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ قَالَتْ: فَسَابَقْتُهُ فَسَبَقْتُهُ عَلَى رِجْلَيَّ، فَلَمَّا حَمَلْتُ اللَّحْمَ سَابَقْتُهُ فَسَبَقَنِي فَقَالَ: «هَذِهِ بِتِلْكَ السَّبْقَةِ» (سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي السَّبَقِ عَلَى الرِّجْلِ، الحدیث 2578)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک سفر میں وہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہمراہ تھیں، آپ فرماتی ہیں میں نے تیز چلنے میں آپ سے مقابلہ کیا اور آپ سے آگے نکل گئی پھر جب میں فربہ ہو گئی تو پھر میں نے آپ سے مقابلہ کیا، اس بار آپ آگے نکل گئے، آپ نے فرمایا یہ پہلی بار کا بدلہ ہے۔

سنن ابو داؤد میں یہ روایت بھی ہے۔

أَنَّ رُكَانَةَ صَارَعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَرَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "

(سنن ابی داؤد بَابٌ فِي الْعَمَائِمِ، الحدیث 4078)

حضرت رکانہ نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کشتی کی، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو پچھاڑ دیا۔

صحیح بخاری کی یہ روایت بھی ملاحظہ کیجیے: قَالَتْ: وَكَانَ يَوْمُ عِيدٍ يَلْعَبُ السُّودَانُ بِالدَّرَقِ وَالحِرَابِ، (صحیح البخاری، الحدیث 2907)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عید کے دن حبشی ڈھال اور آلات حرب کے ساتھ کھیلتے تھے۔

مذکورہ روایات میں اس امر کا واضح ثبوت موجود ہے کہ صحت و قوت کو قائم و برقرار رکھنے، اس کے حفاظت رکھنے، ورزش اور جنگی مشقوں کے پیش نظر صحت مند کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کو اختیار کرنا جائز ہے۔

ماضی قریب کے عظیم عالم ربانی حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید اور صحیح حدیثوں سے یہ مسئلہ نور علیٰ نور ہو جاتا ہے کہ ہر وہ جائز کھیل جس میں جسمانی ورزش سے بدن میں طاقت پیدا ہو تا کہ وہ طاقت دینی و دنیاوی فرائض کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہو بلاشبہ جائز بلکہ مستحب ہے"۔ مسائل القرآن، ص 243) علامہ غلام رسول

سعیدی صاحب شارح صحیح مسلم اپنی شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں: "جسمانی ورزش اور باہمی دل چسپی کے لیے جو کھیل کھیلے جاتے ہیں ان کے کھیلنے سے اگر کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ ہوتا ہو اور کوئی عبادت ضائع نہ ہوتی ہو تو ان کا کھیلنا جائز ہے"

(شرح صحیح مسلم، ج6، ص638)

اس تفصیل کے بعد کرکٹ، فٹ بال کھیلنے کا حکم یہ ہے کہ یہ کھیل حفظان صحت کے لیے خاص ورزش کی نیت سے کھیلے جائیں تو جائز ہیں البتہ یہ اجازت چند شرطوں کے ساتھ مشروط ہے

(1) کھیلنے کی نیت جسمانی ورزش اور حفظان صحت ہو

(2) مقابلہ و معاوضہ اور تفاخر کے طور پر نہ

(3) کسی غیر شرعی امور کا اتکاب نہ ہو۔ مثلاً بے ستری نہ ہو

(4) نماز اور جماعت نہ چھوٹنے پائے

مذکورہ شرطوں کی پابندی کی جائے تو کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا حکمت و مصلحت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز، اگر ان شرطوں کی پابندی نہ ہو تو پھر ممانعت کا حکم ہوگا۔

پب جی گیم کھیلنا متعدد شرعی خرابیوں اور مفاسد کے سبب ناجائز ہے، اولاً یہ خالص لہو و لعب ہے کیونکہ اس کے کھیلنے میں نہ کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ کوئی دنیوی منفعت بلکہ یہ محض کھیل ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں کیونکہ فقہانے صراحت فرمائی ہے کہ لہو و لعب کی جتنی قسمیں ہیں سب باطل ہیں" (بہار شریعت، ج3 ص511) پھر یہ بھی کہ یہ ایک لغو اور لایعنی عمل ہے جس میں وقت کی بربادی اور ضیاع لازم آتا ہے اور وقت کا ضیاع شریعت میں ہرگز محمود نہیں۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ ترجمہ: بندے کے اسلام کی خوبیوں میں سے ہے کہ وہ بے کار و بے نفع بات کو ترک کردے۔ (ابنِ ماجہ، 4/344، حدیث:3976) پھر یہ کہ اس میں موسیقی اور فحش مناظر وغیرہ شامل ہوتے ہیں جو بذات خود علیحدہ طور پر ناجائز و حرام ہیں۔

مزید یہ کہ ایسے کھیلوں کے اثرات کھیلنے والوں کے ذہن و فکر پر منفی طور پر مرتب ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ لڑائی جھگڑے اور فساد جیسے افکار کی طرف مائل ہو سکتا ہے، اور اس سے مختلف حادثات کا خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات یہ خطرات عملاً واقع بھی ہو جاتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا پب جی اور اس جیسے دیگر لغو و لایعنی کھیلوں کا کھیلنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ عَزَّوَجَلَّ

وَرَسُوْلُه اَعْلَم صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّم

حضور اکرم ﷺ کا حلم

سیرت

از: سیدہ غوثی

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول حضرت محمد ﷺ کو بے شمار اعلیٰ اخلاق اور عظیم صفات سے نوازا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو انسانیت کے لیے نمونۂ عمل ہے۔ انہی عظیم صفات میں سے ایک نمایاں صفت حلم و بردباری ہے۔ حلم کا معنی ہے کسی انسان کے اشتعال انگیز رویہ پر اس کے خلاف، قدرت کے باوجود انتقامی کاروائی نہ کرنا۔ یہ صفت نبی کریم ﷺ کی ذات والا صفات بہ تمام و کمال موجود تھی۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں ایسے بے شمار مواقع پر حلم و بردباری کا مظاہرہ فرمایا جہاں عام انسان جذبات میں آکر سخت ردِ عمل اختیار کرلیتا ہے۔ کتب حدیث میں ایسی مثالیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں حضور ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، آپ نے ایک نجرانی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس کا حاشیہ بڑا سخت تھا۔ ایک اعرابی آکر آپ سے ملا اور آپ سے ملا اور آپ کو آپ کی چادر سے پکڑ کر زور سے کھینچا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور ﷺ کے کندھے کو دیکھا تو اس پر زور سے کھینچنے کی وجہ سے چادر کے نشانات پڑ گئے تھے۔ پھر اس اعرابی نے کہا: اے نبی! آپ کے پاس اللہ تعالی کا جو مال ہے اس میں سے کچھ مال مجھے دینے کے احکامات صادر فرمائیے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم اس اعرابی کی طرف متوجہ ہوئے، تبسم فرمایا اور اس کو مال عطا کرنے کے احکامات صادر فرمائے۔ (صحیح البخاری)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: ایک دن حضور اکرم ﷺ نے مال تقسیم فرمایا۔ ایک انصاری شخص نے کہا: یہ ایسی تقسیم ہے جس میں خدا کی رضا کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ راوی کہتے ہیں: میں نے (اپنے دل میں کہا

)خدا کی قسم میں ضرور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گا (اور اس بات کا ذکر کروں گا) میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کچھ لوگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ میں نے چپکے سے وہ بات آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی۔ آپ ﷺ غضب ناک ہو گئے حتی کہ آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے (صرف) اتنا فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں، آپ کو اس سے بھی زیا دہ ستایا گیا لیکن آپ نے صبر کیا۔ (صحیح البخار)

مکی زندگی میں مکہ کے کافروں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر مظالم کے پہاڑ توڑے، طائف میں دعوت حق کے نتیجے میں طائف والوں نے حضور کو پتھروں سے لہولہان کر دیا۔ مکہ والوں نے حالت نماز میں جسد اطہر ہر گندگی پھینکی، اور منافقین ہر موقع پر آپ کے در پئے آزار رہے۔ ان چو طرفہ مظالم کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی زبان سے مبارک سے قوم کے ان ظالمانہ اور جاہلانہ رویوں کے خلاف بھی صرف دعا ہی نکلی۔ لاریب یہ آپ کے حلم کا کمال ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے اوپر ہونے والے تمام مظالم کو اپنے چادر حلم میں چھپالیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے دشمنوں کے پتھر دل آپ کے حلم سے نرم ہو کر آپ کے دامن غلامی سے وابستہ ہو کر شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے۔ اخیر میں حلم کی فضیلت و برکت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادت بھی ملاحظہ کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے الاشجع العصری سے فرمایا: تمہارے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں جن سے اللہ تعالی محبت فرماتا ہے، ایک حلم اور دوسری حیا۔ (سنن ابن ماجہ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس گھونٹ کا اجر اللہ تعالی کے نزدیک سب سے زیادہ ہے وہ غصے کا گھونٹ ہے جو خدا کا بندہ خدا (کی رضا) کے لیے پی جاتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)



سیدنا امام حسین ﷺ سے مروی احادیث مبارکہ

از: شیخ الحدیث علامہ افتخار احمد قادری مدنی

شخصیات

نواسۂ سید کائنات، نورِ روح موجودات، ریحان رسول اللہ ﷺ ، جگر گوشۂ بتو، نور عینِ اسد اللہ، اور سید شباب اُہل جنت امام حسین عالی مقام کے ذکر جمیل سے ہم اپنی زبانیں مشرف و مقدس کریں اور چند خوشبو دار پھول ان کی بار گاہِ عظمت مین نچھاور کر کے اپنی سعادت کو اعلی مقام پر پہونچانے کا شرف پائیں۔ امام حسین نور ہیں، نور کا ٹکڑا ہیں۔ نور کی بہار ہیں اور

تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

وہ حسین جو اثنائے نماز راکب دوش رسالت ہوتے ہوں ان کی رفعت، ان کی جلوت اور ان کی عظمت کو ہمارا کوتاہ قلم کیا بیان کر سکتا ہے مگر حب رسول و عقیدت آل رسول متقاضی ہے کہ اس امام عشق و محبت کی بار گاہ میں خراج عقیدت و مودت کے چند پھول نذر کیے جائیں چنانچہ شان و عظمت امام حسین بیان کرنے والی چند روایات ذیل میں ملاحظہ ہوں، محبت کے ساتھ پڑھیے :

سید کائنات ﷺ نے فرمایا: حسین مجھ سے ہے (میرا خون ہے) اور میں حسین سے ہوں (حسین میرے مشن کو حیات جاوید اں عطا کرنے والا ہے)جو حسین سے محبت کرے گا اللہ تعالی اس سے محبت کرے گا۔ حسین پاکیزہ نسل کا حصہ ہے۔(ابن ماجہ)

ھادی کائنات ﷺ اشارہ فرمارہے ہیں کہ حسین کا وجود قدسی میرے نور بے مثال سے اس عالم میں جلوہ نما ہوا اور یہی میر انور میرے دین کو حیات نو عطا کرنے والا ہے۔

یوں تو ہر شہید بفرمان الٰہی ایک نئ زندگی سے متصف ہوتا ہے مگر حسین تو وہ ہے جس سے یہ کائنات ارضی کو ایک نئ اور تازہ حیات ملے گی اور بفرمان رسول اللہ ﷺ میدان محشر بھی اس کے خوشبو دار خون سے معطر ہو گا اور اس عطر بیز ماحول میں خلائق نہار ہی ہو گی۔

(۲) سرکار ﷺ نے فرمایا: حسن و حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں جو ان دونوں سے محبت کرے گا وہ لاریب مجھ سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض عداوت رکھے گا وہ مجھ سے عداوت رکھے گا۔ (جامع المسانید والسنن)

سبحان اللہ! حضرات حسنین کا یہ کتنا بڑا اعزاز و اکرام ہے کہ سارے نوجوانان اہل جنت پر سیادت کا عظیم تاج سجائے ہوئے یہ دونوں شہزادے میدان محشر میں نمودار ہوں گے اور اپنے خونِ مقدس سے پورے محشر کو معطر کر رہے ہوں گے۔ سید کائنات ﷺ سے محبت ایمان کا جزء لاینفک ہے اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا بعینہ جو حسنین سے محبت نہیں رکھتا وہ ایمان کی دولت لازوال سے محروم ہے۔ اور خسر الدنیا و الآخرۃ کا مصداق ہے اور دنیا و آخرت دونوں میں خائب و خاسر ہے۔

سید کونین ﷺ منبر مبارک پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اتنے میں حضرت حسن و حضرت حسین سرخ کرتا زیب تن کیے ہوئے چلتے پھسلتے منبر کے پاس پہونچے، سید کائنات ﷺ منبر سے اترے اور دونوں کو گود میں اٹھایا اور منبر کے سامنے بٹھایا پھر آقا ﷺ نے فرمایا: سچ فرمایا رب کریم نے "انما اموالکم و اولادکم فتنۃ" تمہارے مال اور تمہاری اولاد امتحان ہیں۔ سرکار نے فرمایا ان دونوں کو چلتے پھسلتے دیکھ کر صبر و تحمل نہ کر سکا اور خطبہ منقطع کر کے ان کو اپنے پاس لایا۔

امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شان عظمت تو ملاحظہ کریں کہ سید الانس و الجن ﷺ خطبہ کا سلسلہ منقطع فرما کر نیچے تشریف لاتے ہیں اور پھر ان کو منبر پر بٹھا کر خطبہ کا آغاز فرماتے ہیں۔

سبحان اللہ! سید کائنات ﷺ فریضۂ دینی کو موخر فرما کر اپنے شہزادوں کو نوازتے ہیں اور تعلیم مرحمت فرماتے ہیں کہ میری آل سے جو اس طرح محبت کرے گا وہی صراط مستقیم پر گامزن ہو گا اور دونوں جہانوں کی سعادت کو اپنے دامن میں سمیٹے گا اور کامرانی سے ہمکنار ہو گا۔ اب امام حسین سے مروی احادیث مبارکہ کے پر نور کلمات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت امام حسین عالی مقام نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آقا کریم ﷺ فرماتے ہیں:

"ما من مسلم ولا مسلمة يُصاب بمصيبة فيذكرها وإن طال عهدها"، قال عباد: "قَدُم عهدها، فيُحدث لذلك استرجاعاً، إلا جدّد الله له عند ذلك، فأعطاه مثلَ أجرها يوم أُصيبَ بها."

(مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ج2 ص350)

ترجمہ: جو بھی مؤمن مرد یا عورت کسی مصیبت میں پڑ جائے پھر اس کو وہ مصیبت طویل عرصے گزرنے کے بعد یاد آجائے پھر یہ بندہ اس پر "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ" پڑھے تو اللہ تعالیٰ پھر ایک بار اسے وہی اجر و ثواب عطا فرماتا ہے جس دن اسے یہ مصیبت پہونچی تھی (اور اس نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ" پڑھا تھا)

معنی حدیث: آقا ﷺ تعلیم دے رہے ہیں کہ کسی عزیز یا کسی مومن کے انتقال پر یا کسی مصیبت کے لاحق ہونے پر جو بندۂ مومن "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ" کہے گا وہ بفرمان الٰہی عظیم اجر اور صبر پر اللہ کریم کی معیت سے سرفراز ہو گا۔ پھر بعد

میں کبھی بھی کسی کا انتقال یا کوئی اور مصیبت یاد آجائے اور یہ بندہ پھر " اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ " پڑھے تو پھر اسے پہلی مصیبت کے لاحق ہونے پر رب تعالیٰ نے جس اجر کا وعدہ کیا تھا وہی اجر جب جب بندہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ "پڑھے گا اسے ملتا رہے گا، فسبحان الله العظيم !

رب کریم کا وعدہ بھی بے مثال اور آقا کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ارشاد بھی بے مثال اور راوی حدیث امام حسین بے مثال۔

(۲) امام عالی مقام سیدنا الحسین سے روایت ہے آقا کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

حملةُ القرآن عُرفاءُ أهل الجنة يوم القيامة۔ (جامع المسانید والسنن، ج 3-4 ص 808)

ترجمہ: قرآن حفظ اور اہتمام کرنے والے بروز قیامت اہل جنت کے عرفاء ہوں گے۔

حفاظِ قرآن کے مناقب سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ امام حسین عالی مقام کے والد ماجد اسد اللہ سیدنا علی سے روایت ہے رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: من قَرَأَ الْقُرْآن فاستظهره فأحل حَلَاله وَحرم حرَامه أدخلهُ الله بِهِ الْجنَّة وشفعه فِي عشرَة من أهل بَيته كلهم قد وَجَبت لَهُم النَّار۔ (الترغیب والترھیب)

ترجمہ: جس نے قرآن پڑھا اور اس کا حافظ ہو گیا اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھا ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا اور اس حافظ کی شفاعت اس کے گھر کے ایسے دس افراد کے حق میں قبول فرمائے گا جن کے لیے جہنم لازم ہو چکی تھی۔

حضرت امام عالی مقام سیدنا حسین سے روایت ہے، رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: "من ذكرت عنده فخطئ الصلاة عليّ خطئ طريق الجنة "۔ (جامع المسانید والسنن۔ ج 3-4 ص 806)

ترجمہ: جس شخص کے پاس میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے وہ جنت کا راستہ نہ پائے گا۔

بلاریب درود وہ عظیم شئ ہے جس کی طرف رب تعالیٰ بھی متوجہ ہے اور کائنات کے سب اصحاب شرف واصحابِ عظمت متوجہ ہیں حتی کہ ملائکہ حجابات بھی متوجہ ہیں۔ بخاری شریف میں ہے: "صلاته عليه يعنى ثنائه عليه "یعنی رب تعالیٰ اپنے حبیب کی حمد و ثنا کر رہا ہے۔ الغرض، سیدنا امام حسین سے مروی مذکورہ روایت سے درود پاک کے حسنات وبرکات کا علم ہوتا ہے۔ آپ سے متعدد روایات منقول ہیں جن میں علم و معرفت کے گراں قدر موتی، احکامِ شرعیہ کے دقیق مسائل اور رشد و ہدایت کے بے بہا خزانے محفوظ ہیں۔

شخصیات

سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی
اردو کے پہلے ادیب و مصنّف



از: مولانا طفیل احمد مصباحی

اردو زبان وادب کے فروغ واستحکام اور اس کی ترویج واشاعت میں صوفیائے کرام کی خدمات تاریخی مسلّمات سے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق کی بلند پایہ تحقیقی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" اس کی واضح مثال ہے، جس میں صوفیائے کرام کی ادبی و لسانی کارگزاریوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ نے دین و مذہب کی تبلیغ و توسیع کے علاوہ کس طرح گیسوئے ادب کی مشاطگی کی ہے اور اس کی نشو و نما میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے لیے ضروری ہے کہ مبلغ عوامی زبان سے پوری طرح واقف ہو۔ اردو زبان سے صوفیائے کرام کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ دعوت و تبلیغ بھی رہی ہے۔ عوام وخواص کے دلوں پر حکومت کرنے والے صوفیائے کرام اور مشائخِ ملت عوامی زبان اس لیے سیکھتے کہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ بہتر اور مؤثر طریقے پر انجام پا سکے۔ مولوی عبد الحق کے بقول:

”علما و امرا بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے بھی وہ کام نہیں ہو سکتا جو فقیر اور درویش کر گزرتے ہیں۔ بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر کا دربار عام ہے جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب، عالم جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان ومال کا مالک ہوتا ہے، لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کا اثر محدود ہوتا ہے اور اِن کا (صوفیوں اور درویشوں) بے پایاں۔ اور یہی سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت و اقتدار حاصل ہو جاتا تھا کہ بڑے بڑے جبّار اور باجبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔ مسلمان درویش ہندوستان میں پُر خطر اور دشوار گزار رستوں، سر بفلک پہاڑوں اور لق ودق بیابانوں کو طے کر کے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمان کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبعیت کے مخالف تھی۔ جہاں کی آب وہوا، رسم ورواج، صورت و شکل، آداب واطوار، لباس، بات چیت غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو

اہلِ ملک سے اور اہلِ ملک کو ان سے وحشت ہو۔ لیکن حال یہ ہے کہ انہیں وصال کیے صدہا سال گزر چکے ہیں، لیکن اب بھی ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا صبح وشام ان کے آستانوں پر پیشانیاں رگڑتے ہیں اور جن جن مقامات پر ان کے قدم پڑے تھے وہ اب تک "شریف" اور "مقدس" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کے کھینچنے کا وہ سامان تھا جو نہ امرا و سلاطین کے پاس ہے اور نہ علما و حکما کے پاس۔ لیکن دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا تھا۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجبِ برکت سمجھتے۔ عام وخاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین (دعوت و تبلیغ) کے لیے انہوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے، ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمینِ ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے، وہ باوجود عالم وفاضل ہونے کے عوام سے انہیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ یہ بڑا گُر تھا اور صوفیا اسے خوب سمجھتے تھے۔"

(اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص 3 : 4، ناشر: انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی)

ہندوستان میں چشتی صوفیا و مشائخ نے جہاں دین و مذہب کی گراں قدر خدمات انجام دیں، وہیں علوم و ادبیات کے فروغ و استحکام میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا۔ کتب و رسائل اور ملفوظات و مکتوبات کی صورت میں صوفیائے چشت اہلِ بہشت کے علمی و ادبی کارناموں کی سینکڑوں مثالیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء اور آپ کے خلفا اور خلفا کے خلفا نے دین و دانش اور ادب و ثقافت کی اہم خدمتیں انجام دیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیگم ریحانہ فاروقی (مدیرۂ اعلیٰ آستانہ، دہلی) لکھتی ہیں:

"اگر ہم یہ کہیں کہ دلی میں اردو ادب کی خدمت کے آغاز اور اس کی ترویج و ترقی کے بانی و معمارِ اول حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ حضرت کی خانقاہ دینی و روحانی تعلیم کا تو مرکز تھی ہی، لیکن یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ محبوب الٰہی یہ چاہتے تھے کہ ایک ایسی ہلکی پھلکی زبان وجود میں آئے جو عوام کے درمیان باہمی خلوص و رابطہ کا آسان ذریعہ بن سکے اور صوفیا و مشائخین اور علمائے دین اس کے ذریعہ بہ آسانی مؤثر طور پر تبلیغِ دین کر سکیں، درسِ طریقت و ریاضت دے سکیں اور اس زبان کے ذریعہ بندگانِ خدا کی حقیقی معنوں میں اثر آفریں رہنمائی و رہبری کر سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت نے خود اردو میں کوئی تحریری کام انجام نہیں دیا، جس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت موصوف نے عبادت و ریاضت اور مخلوق خدا کی بے لوث خدمت کو اولیت اور ترجیح دی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مصروفیات کے حلقہ میں رہ کر کوئی تحریری کام کرنے کا وقت نکالنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے عزیز ترین سعادت مند و فرماں بردار

مرید و شاگرد رشید حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس مقصد کے آغاز و حصول کے لیے احساس دیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت امیر خسرو اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے کامیاب معمار اول ثابت ہوں گے۔ "

(دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات، ص 24 : ،ناشر: اردو اکادمی، دہلی)

حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفا کے خلفا میں ایک نمایاں ترین ہستی کا نام حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ ہے، جنھوں نے دعوت و تبلیغ، مذہب و روحانیت اور علم و ادب کی وسیع پیمانے پر خدمت انجام دی۔ آپ جامعِ شریعت و طریقت تھے۔ لطائفِ اشرفی اور مکتوباتِ اشرفی کے مطالعہ سے علومِ ظاہری و باطنی میں آپ کے رسوخ و مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مختلف دینی و علمی موضوعات پر دو درجن سے زائد کتب و رسائل آپ کے تبحرِ علمی پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ کو بہت ساری علمی و روحانی فضیلتیں حاصل ہیں۔ آپ کے علمی و ادبی فضائل میں سے ایک نمایاں ترین فضیلت یہ بھی ہے کہ آپ اردو کے پہلے مصنف ہیں۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ کے اردو رسالۂ اخلاق و تصوف کی دریافت میر نذر علی دردؔ کاکوروی کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور اس کے لیے وہ پوری دنیائے ادب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی نے نذر علی دردؔ کاکوروی کی اس عظیم تحقیقی دریافت کو سراہا ہے اور دوسرے ادبا و محققین کی صرف اس لیے سرزنش کی ہے کہ اس تحقیقی دریافت کا سہرا دردؔ کاکوروی کے بجائے پروفیسر حامد حسن قادری کے سر کیوں باندھا جاتا ہے۔ اردو کی پہلی تصنیف اور اردو کے پہلے مصنف کے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں اور قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ کسی نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو تو کسی نے کو حضرت امیر خسرو کو اردو کا پہلا مصنف قرار دیا ہے، لیکن میر نذر علی دردؔ کاکوروی کی تحقیق و دریافت کے مطابق حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی اردو کے پہلے ادیب و مصنف قرار پاتے ہیں۔ دردؔ کاکوروی جب یہ نئی تحقیق لے کر اپنی دھماکے دار انٹری کے ساتھ میدانِ ادب میں وارد ہوئے تو اردو نثر کی تاریخ کے سابقہ بلند بانگ دعوے اور بہت سارے مزعومات و مسلّمات کی دیواریں منہدم ہو گئیں اور رفتہ رفتہ اربابِ ادب و تحقیق اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ سید اشرف جہانگیر سمنانی واقعی اردو کے پہلے ادیب و مصنف ہیں اور اخلاق و تصوف سے متعلق ان کا تحریر کردہ بلند پایہ رسالہ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں عصری دانش گاہوں سے تعلق رکھنے والے فضلا اور ماہرینِ زبان و ادب کے وقیع افکار و آرا جمع کیے گئے ہیں، تاکہ علمی و ادبی حلقوں میں اس فکر و خیال کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

(۱) سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ سے متعلق دردؔ کاکوروی کی تحقیقی دریافت اور دردؔ صاحب کی تحقیقی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی لکھتے ہیں:

”دنیا کی ہر زبان کے نگار خانے میں ہم کو تین طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو صرف شاعری کرتے ہیں۔ دوسرے جنھوں نے نثر نگاری کو اپنا شعار بنایا اور تیسرے وہ جو شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے شاعری بھی کی اور نثر کے میدان میں بھی اپنے اشہبِ قلم کو جولاں کیا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا بعید از موضوع نہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کی تعداد خال خال ہے جن کو نظم اور نثر دونوں میں کامل دستگاہ حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دردؔ کی ایوانِ ادبِ اردو میں اہمیت و افادیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ دردؔ کاکوروی نے اپنے عہدِ شباب میں شاعری کے ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی خاص توجہ کی اور مختلف تاریخی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی نثر میں سادگی اور سلاست کے ساتھ علمی سنجیدگی ہے۔ اسی لیے ان کے ادبی اور تاریخی مضامین میں ان کی فکر پوری طرح ظاہر ہوئی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس وقت دردؔ نے زبان پر جس قدرت کا ثبوت دیا ہے، وہ انشا پردازی نہیں ہے، بلکہ فکر و خیال کی ترسیل کا کامیاب نمونہ ہے۔ نثر میں دردؔ کئی حیثیتوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت مصنف بھی ہیں اور مؤلف بھی، محقق بھی ہیں اور ناقد بھی، مرتب بھی ہیں اور مؤرخ بھی۔ انہوں نے اپنی نثر میں مختلف النوع مضامین یادگار چھوڑے ہیں۔“

دردؔ کاکوروی جس پایہ کے شاعر ہیں، اسی پایہ کے نثر نگار بھی ہیں۔ اردو نثر میں ان کے دو مضامین ایسے ہیں جنھوں نے بحیثیتِ نثر نگار ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ایک مضمون تو وہ ہے جس میں انہوں نے مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے "رسالۂ معرفت" کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ اگرچہ یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی ہے، پھر بھی اس کتاب کے وجود سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دردؔ کاکوروی نے خود ۲۰۷ صفحات پر مشتمل مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی اس قلمی کتاب کو دیکھا تھا اور اس کے چند جملے بھی بطورِ نمونہ پیش کیے تھے۔ ان کا یہ مضمون (ماہنامہ) نگار، دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا اور پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستانِ تاریخ اردو" میں اس رسالہ کو اردو کی پہلی کتاب تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

”میر نذر علی دردؔ کاکوروی رسالہ نگار بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانہ میں زبان ہندی کہا کرتے تھے)، خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ / صفحہ کی ہے۔ اس کے ص : ۱۱۸ کی عبارت کا ایک ٹکڑا یہ ہے: "اے طالب ! آسمان و زمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں سمجھ کا کچھ ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات"۔“

دردؔ کاکوروی کی یہ تحقیق حامد حسن کے حوالے سے اتنی مشہور ہوئی کہ ادبی حلقوں میں انہیں کے نام سے منسوب ہو گئی۔ حالاں کہ قادری صاحب نے اس سلسلہ میں دردؔ کاکوروی کی تحقیق کا ہی حوالہ دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ڈاکٹر نسیم قریشی نے

بھی یہی غلطی کی ہے کہ حامد حسن قادری کی کتاب دیکھے بغیر ہی انہوں نے اپنی کتاب "اردو ادب کی تاریخ" کے ص:۱۱۹ پر لکھ دیا کہ پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش و تحقیق نے ایک اردو رسالہ کا پتہ لگایا ہے جو "دہ مجلس" سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۰ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی ہیں۔ اب علمی حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جانے لگی ہے کہ یہ دریافت دردؔ کاکوروی کی مرہون منت تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایڈیٹر ماہنامہ نگار، کراچی (پاکستان) نے لکھا ہے کہ:

”شعبۂ تحقیق میں بھی اہل کاکوری کے بعض اضافے بہت اہم ہیں۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی نے "نگار" دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں حضرت امیر خسرو کے ایک معاصر اشرف جہانگیر سمنانی کے "رسالۂ معرفت" کا سراغ دے کر اہلِ نظر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف یہی رسالہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اردو میں نظم و نثر کے آغاز کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے اور اُردو نثر کی تاریخ بھی کوئی سات سو سال پرانی ہو جاتی ہے۔“

(میر نذر علی دردؔ کاکوروی : حیات اور کارنامے، ص285 : 286، ناشر : مخمور کاکوروی، تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی)

(۲) ڈاکٹر حامد حسن قادری، دردؔ کاکوروی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”خواجہ سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے (جن کا مزارِ مبارک کچھوچھہ شریف علاقۂ اودھ میں ہے) اُردو میں ایک رسالہ "اخلاق و تصوف" پر ۱۳۰۸ء / ۷۰۸ھ میں تصنیف کیا۔ نثرِ اردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں۔ سید اشرف جہاں گیر سمنانی صاحب ۱۲۸۹ء / ۶۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر پا کر بہ حسابِ قمری ۱۴۰۵ء / ۸۰۸ھ میں وفات پائی۔ "خالقِ باری" کا سالِ تصنیف معلوم نہیں۔ لیکن چوں کہ امیر خسرو، سید اشرف صاحب سے عمر میں ۳۵ سال بڑے ہیں، اس لیے "خالقِ باری" کو مقدم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے سید اشرف صاحب کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اردو زبان میں تصنیفِ اولین یہی ہو۔ بہر حال اولیت انہیں دونوں (حضرت امیر خسرو و حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی علیہما الرحمہ) میں دائر ہے۔ اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیفِ نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید شرف جہاں گیر کے "رسالہ تصوف" کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہاں گیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔“

(تاریخ و تنقید، ص:۹، ناشر : لکشمی نرائن اگروال پبلشر، آگرہ)

ڈاکٹر حامد حسن قادری اپنی دوسری مدلل تحقیقی کتاب "داستان تاریخِ اردو" میں لکھتے ہیں:

”خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (جن کا مزار کچھوچھہ شریف علاقۂ اودھ میں ہے) نے اُردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۱۳۰۸ء / ۷۰۸ھ میں تصنیف کیا۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی "رسالہ نگار لکھنؤ" بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ "سید اشرف

جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں ہندی زبان کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے۔ اس کے صفحہ:۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے: اے طالب! آسمان و زمین سب خدا میں ہے۔ ہو اسب میں خدا ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔ نثر اُردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سید اشرف صاحب جہانگیر ۱۲۸۹ء / ۶۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر کو پہنچ کر ۱۴۰۵ء / ۸۰۸ھ میں وفات پائی۔ "خالقِ باری" کا سال تصنیف معلوم نہیں لیکن چوں کہ امیر خسروؔ، سید اشرف سے عمر میں ۳۵ سال بڑے ہیں۔ اس لیے خالق باری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے سید اشرف صاحب کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اُردو زبان میں تصنیفِ اولین یہی ہو۔ بہر حال اولیت انہیں دونوں میں دائر ہے۔ بعض محققین کی نظر میں "خالقِ باری" کا انتساب حضرت امیر خسرو سے مشتبہ ہے۔ اس نظریہ کی بناپر اگر خالق باری کسی بعد کے مصنف کا کارنامہ ہے تو پھر سید اشرف جہانگیر کا رسالہ تصوف ہی اُردو کی پہلی کتاب ہے۔ اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیفِ نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالۂ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔ "

(داستان تاریخ اردو، ص : ۵۳، ۵۴، ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

(۳) پروفیسر اختر اورینوی (صدر شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی، بہار) اپنے تحقیقی مضمون "بولیوں کا سنگم" میں لکھتے ہیں:

" دہلی اور بہار اسکول میں مماثلت ضرور ہے۔ لیکن ہر دو نے ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہوئے انفرادی طور پر ترقی کی ہے اور دونوں اسکول از خود پیدا ہوئے۔ میر حسن کے استاد میر ضیاؔ دہلی سے عظیم آباد چلے آئے۔ اشکیؔ اور جمالیؔ نے خواجہ میر دردؔ سے اصلاحیں لیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ خود میر تقی میرؔ، جعفرؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ راسخؔ عظیم آبادی اور جوششؔ عظیم آبادی کی شاعری میرؔ و سوزؔ کی شاعری کا جواب ہے۔ غالبؔ نے بیدلؔ عظیم آبادی کے کلام کو سامنے رکھ کر مشقِ سخن کی۔ موجودہ تحقیقات کی بناپر تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسروؔ اور حضرت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے بعد دہلی اور صوبۂ متحدہ میں اُردو کو اُس وقت تک فروغ نہ ہوا، جب تک ولیؔ دکنی نے دہلی کے تخیل کو آکر نہ چھیڑا۔ "

(تحقیق و تنقید، ص:۳۰، ناشر: کتابستان، الہٰ آباد)

(۴) اردو کے مایۂ ناز ادیب و محقق پروفیسر مظفر اقبال (سابق صدر شعبۂ اُردو بھاگل پور یونیورسٹی، بھاگل پور، بہار) کے بقول:

”مولوی عبد الحق صاحب کی کوششوں سے جب جنوبی ہند کا بیش قیمت سرمایۂ ادب اہلِ فکر و نظر کے سامنے پیش ہوا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ شمالی ہند سے بہت پیش تر جنوبی ہند میں اُردو نثر میں ترجمہ و تالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ محققین نے دکن میں اردو نثر کا پہلا مصنف شیخ عین الدین گنج العلم متوفیٰ: ۱۳۹۳ء / ۷۹۵ھ کو قرار دیا ہے لیکن ان کے رسائل کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متوفیٰ: ۱۴۲۲ء / ۸۲۵ھ ہم نہ کی تصنیف "معراج العاشقین" کو دکن میں اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سن کتابت ۱۴۴۲ء بتایا جاتا ہے اور سنِ تصنیف ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۸ء سے قبل۔ معراج العاشقین کی دریافت کے بعد عرصۂ دراز تک اسے اُردو نثر کی اولین تصنیف کا درجہ حاصل رہا اور اردو نثر نویسی کے سلسلے میں جنوبی ہند کی اولیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن سید اشرف جہانگیر سمنانی کی نثری تصنیف کی دریافت کے بعد اولیت کا سہرا پھر شمالی ہند کے سر پر باندھ دیا گیا اور اب تک کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ معراج العاشقین کی تصنیف سے ۱۷ سال پیش تر شمالی ہند کے جلیل القدر صوفی سید اشرف جہانگیر سمنانی (متولد: ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء - وفات: ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء) نے اردو نثر میں جو رسالہ تصنیف کیا تھا، وہی اُردو نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کا سنِ تصنیف ۷۰۸ھ مطابق ۱۳۰۸ء ہے اور موضوع اخلاق و تصوف ہے۔ “

(بہار میں اردو نثر کا ارتقا، ص: ۱۴، ۱۵، ناشر: کتاب خانہ ترپولیا، پٹنہ، بہار)

(۵) مشہور محقق پروفیسر وقار احمد رضوی لکھتے ہیں:

”اردو نثر کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اردو نثر کا قدیم نمونہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ ہے جو ۷۰۸ھ مطابق ۱۳۰۸ء کا ہے۔ پھر شیخ عین الدین گنج العلم متوفیٰ: ۷۹۵ھ کی تصانیف کا حوالہ ملتا ہے۔ اس کے بعد معراج العاشقین از خواجہ بندہ نواز گیسو دراز گلبر گوی کا ذکر آتا ہے۔ “

(ممبئ عظمیٰ کی تاریخ، ص: ۶۶، ناشر: ادارہ معارفِ اسلامی، ممبئ، بحوالہ تاریخ نقد، ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، پاکستان ۲۰۰۴، ص: ۲۸۵)

(۶) ڈاکٹر عابدہ بیگم (شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی) لکھتی ہیں:

”تمام محققین نے "کربل کتھا" کو شمالی ہند کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق اس سے پہلے نثری تصانیف کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کے ادبی یا معیاری ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کو نثری تصانیف کی صف سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین نے سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے مدوخاں کے رسالے کو نقشِ اول بتایا ہے۔ انھیں یہ رسالہ بیجاپور میں دستیاب ہوا۔ اس رسالے کے ساتھ دو اور منظوم رسالے پند نامہ اور چکی نامہ بھی منسلک تھے، سنِ تصنیف درج نہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اس کی زبان اور اندازِ بیان کو دیکھتے

ہوئے اسے سید اشرف جہانگیر سمنانی سے قبل کی تصنیف قرار دیتی ہیں۔ حامد حسن قادری نے سید اشرف جہانگیر سمنانی کے اردو رسالے کا ذکر کیا ہے۔ قادری صاحب نذرؔ کاکوری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سید مخدوم اشرف کا یہ رسالہ اخلاق و تصوف پر مبنی ہے۔ اس رسالہ میں مصنف نے اپنے بزرگ کے ارشادات کو جمع کر کے رسالے کی شکل دے دی ہے۔ ‘‘

(اردو نثر کا ارتقا، ص:۱۳۰، ۱۴۰، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

(۷) مشہور ناقد و محقق اور ادیب و صحافی ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ایڈیٹر "نگار") نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالۂ تصوف و معرفت اردو کی پہلی تصنیف ہے اور اردو نظم و نثر کے آغاز کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

’’شعبۂ تحقیق میں بھی اہل کاکوری کے بعض اضافے بہت اہم ہیں۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی نے "نگار" دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں حضرت امیر خسرو کے ایک معاصر اشرف جہانگیر سمنانی کے "رسالۂ معرفت" کا سراغ دے کر اہلِ نظر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف یہی رسالہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اردو میں نظم و نثر کے آغاز کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے اور اُردو نثر کی تاریخ بھی کوئی سات سو سال پرانی ہو جاتی ہے۔ ‘‘

(پیش لفظ سخنورانِ کاکوری، ص 13 :، ناشر: میخانۂ ادب، ناظم آباد، کراچی)

(۸) ڈاکٹر نسیم قریشی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اپنی بلند پایہ تصنیف "اردو ادب کی تاریخ" میں سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالۂ اردو (جو اخلاق و تصوف پر مشتمل ہے) کی لسانی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور دردؔ کاکوروی و حامد حسن کی تائید کرتے ہوئے آپ کے مذکورہ بالا رسالے کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

’’شمالی ہند میں اردو شعر گوئی کا عام رواج محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے ہوا۔ جب ولیؔ دکنی کے دوبارہ دورۂ دہلی نے دار السلطنت میں ادبی چہل پہل کی نئی فضا پیدا کر دی، شمالی ہند کے باکمالوں نے اس ذوق و شوق، طبیعت داری اور فن کے رچاؤ کے ساتھ اُردو شاعری کو وسیلۂ اظہارِ خیال بنایا کہ بہت جلد اس کا بلند فنی معیار قائم ہو گیا، لیکن شمالی ہند میں ادب اور زندگی پر فارسی کا تسلط اس قدر شدید اور قوی تھا کہ اردو نے بڑی صبر آزما منزلیں طے کر کے اور ایک حد تک اپنا جوہر کھو کر باقاعدہ ادبی حیثیت اختیار کی۔ ۱۸۰۰ء تک شمالی ہند میں اردو نثر نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ شمالی ہندی اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی "دہ مجلس" ہے جس کا سنِ تصنیف ۱۷۳۲ء ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش و تحقیق نے ایک اور رسالہ کا پتہ لگایا ہے جو "دہ مجلس" سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۸ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانی ہیں۔ رسالہ اخلاق و تصوف سے متعلق ہے۔ اس کی تمام تر اہمیت لسانی ہے۔ ‘‘

(اردو ادب کی تاریخ، ص 129 :، ناشر: ادارۂ فروغِ اردو، لکھنؤ)

(۹) ڈاکٹر عبد الرؤف (سابق صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی) لکھتے ہیں:

”اردو کا ایک رسالہ ’تصوف اور چند فقرے حضرت اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ سے منسوب ہیں.........خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۱۳۰۸ء/ ۷۰۸ھ میں تصنیف کیا۔“

(مغربی بنگال میں اردو کا لسانیاتی ارتقا، ص99 : ،ناشر : مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کلکتہ)

(۱۰) ماضی قریب کے مشہور محقق و مؤرّخ پروفیسر سید حسن عسکری، پٹنہ نے بھی سید اشرف جہانگیر سمنانی کی طرف ایک اردو رسالہ منسوب کیے جانے کی بات کہی ہے اور بتایا ہے کہ جب تک اس پر تنقیدی نظر نہ ڈالی جائے، اس کی قدامت و اصلیت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”حضرت اشرف جہانگیر سمنانی سے ایک رسالہ اردو منسوب ہے، لیکن جب تک اس پر نظر غائر نہ ڈالی جائے اس کی قدامت و اصلیت کے متعلق صرف دو تین اشعار سے کچھ فیصلہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن ہندی کی واقفیت اور استعمال کی شہادت تو خود لطائفِ اشرفی میں موجود ہے۔“

(عہدِ وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ، ص52 :،53 ،ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)

ان دلائل و شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کا شمار اردو ادب کے سابقین اولین مصنفین میں ہوتا ہے اور آپ کا مذکورہ رسالہ اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ حضرت مخدوم پاک کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ بعض سوانح نگاروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلسلۂ چشتیہ میں آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف جس قدر توجہ دی ہے اور جتنی کتابیں لکھی ہیں، شاید ہی کوئی دوسرے چشتی بزرگ آپ کے مثل ہوئے ہوں۔ آپ کی زندگی کا چوتھائی حصہ (تقریباً تیس سال) سفر میں گذرا۔ سفر میں کتابوں کا ذخیرہ ساتھ رکھتے اور دورانِ سفر وعظ و ارشاد اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ دورانِ سفر لوگوں کی فرمائش پر کتابیں لکھ کر ان کے حوالے کر دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اگر آپ کی کتابوں کی نقلیں محفوظ رکھی جاتیں تو آج دنیا آپ کی تصنیفی کثرت کا اعجاز ملاحظہ کرتی۔ مجدّدِ سلسلہ اشرفیہ، شیخ المشائخ حضرت مولانا شیخ محمد علی حسین اشرفی کچھوچھوی (معروف بہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں) آپ کی تصانیفِ عالیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”حضرت مولانا ابو الفضائل نظام الدین یمنی خلیفۂ مخدوم اشرف و جامعِ ملفوظات لطائفِ اشرفی فرماتے ہیں کہ حضرت محبوب یزدانی کا علم عجیب خداداد علم تھا۔ روئے زمین میں جہاں تشریف لے جاتے وہیں کی زبان میں وعظ فرماتے اور اسی زبان میں کتاب تصنیف کر کے وہاں کے لوگوں کے لیے چھوڑ آتے۔ بہت سی کتابیں آپ نے عربی، فارسی، سوری، زنگی اور ترکی مختلف ملک کی زبانوں میں تصنیف فرمائیں، جن کی فہرست اگر لکھی جائے تو ایک طومار ہو جائے گی۔ علمائے جلیل القدر کا قول ہے کہ جس قدر تصانیف حضرت محبوب یزدانی نے فرمائیں بہت کم علماء اس قدر تصانیفِ کثیرہ کے مصنف ہوں گے۔ کتاب کنز

الاسرار، ذکر اسمائے الٰہی اور تسخیرِ کواکب حضرت نے تالیف فرمائی جس کی تعلیم مجھ کو حضور سے حاصل ہوئی تھی۔ یہ عجیب کتاب آپ کی تالیفات سے فنِّ تکسیر میں تھی۔ تصانیفِ کثیرہ آپ کی اس قدر ہیں کہ جس کی فہرست لکھنا محال ہے۔ اکثر کتابیں آپ کی تالیفات سے بنام قدوۃ الخوانین حضرت سیف خاں (خلیفۂ مخدوم اشرف) جو داماد فیروز شاہ بادشاہ دہلی کے تھے، تصنیف ہوئیں اور اس فقیر نظام یمنی نے دو جلدیں حضرت کے ملفوظات سے کتاب "لطائف اشرفی" اور کتاب "سرّ الاسرار" اور رقعات حضرت کے جمع کر کے اس کو "مرقوماتِ اشرفی" کے نام سے موسوم کیا اور کتاب "سکندر نامہ" حضرت نظامی گنجوی کی بھی شرح لکھی۔ ان کتب کے علاوہ مقاماتِ مختلفہ میں حضور محبوب یزدانی نے جو کتابیں تحریر فرمائیں، ان میں سے خاص خاص کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

امام عبد اللہ یافعی کے ارشاد اور شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کی روحانی بشارت سے کتاب "عوارف المعارف" کی آپ نے شرح لکھی۔ جب روم تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ کی کتاب "فصوص الحکم" کی شرح لکھی اور اس کو صاحب المعارف شیخ نجم الدین ابن شیخ صدر الدین فغانی کے سامنے پیش کیا اور عرض کیا کہ میں نے اس شرح کو حضرت شیخِ اکبر کے حکم پر لکھا ہے۔

حضرت محبوب یزدانی جب عرب تشریف لے گئے تو اہلِ عرب نے حضرت کے رسائلِ تصوف کی طرف بڑی توجہ دی کیا اور وہاں آپ نے کتاب "قواعد العقائد" عربی زبان میں تصنیف فرمائی۔ حضرت نے اہلِ عرب میں تقسیم کے واسطے خاص کر یہ کتاب لکھی، جیسا کہ مولانا اعظم مولانا علی نے لمعات کو عربی کیا۔ آپ نے اس کی شرح بھی عربی زبان میں لکھی اور بہت کچھ اسرارِ معارفِ الٰہی اس میں درج فرمائے۔ جب حضرت محبوب یزدانی اطرافِ عراق و خراسان و ماوراء النہر میں تشریف لے گئے تو وہاں کے سادات نے کتاب "بحر الانساب" پیش کی۔ حضرت محبوب یزدانی نے کتاب مذکور سے منتخب کتاب "اشرف الانساب" تصنیف کی اور کتاب "بحر الاذکار" بھی وہاں تصنیف فرمائی اور رسالہ "اشرف الفوائد" اور "فوائد الاشرف" صوبۂ گجرات میں تصنیف فرمایا اور کتاب "بشارۃ الذاکرین" اور رسالہ "تنبیہ الاخوان" اور رسالہ "بشارۃ الاخوان" بپاسِ خاطر حضرت سیف خان تصنیف فرمائے اور روم کے سفر میں رسالہ "مصطلحاتِ تصوف" تحریر فرمایا اور رسالہ "مناقب خلفائے راشدین و فضائل اصحاب رسول اللہ ﷺ" لکھا جس پر علمائے محمد آباد گوہنہ نے کثیر مناقبِ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے سبب اعتراض کیا تھا اور چند رسائل تصوف میں بمقام روم اور لکھے جن کے نام یاد نہیں۔ رسالہ "حجۃ الذاکرین" بنگال میں تصنیف فرمایا۔ اس رسالہ میں پانچوں وقت بعد ادائے فریضہ تین بار بآوازِ بلند کلمۂ طیبہ کا ثبوت احادیث اور تفاسیر سے فرمایا ہے۔ اس رسالہ کو "نصیحت نامہ" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ کتاب "فتاوائے اشرفیہ" بزبان عربی محض بپاسِ خاطر

حضرت نور العین تحریر فرمایا۔ اس کتاب میں مسائلِ فقہ بڑی بڑی کتابوں سے انتخاب کر کے تصنیف فرمایا۔ یہ فتاویٰ جامعِ مسائل ضروریہ مذہبِ حنفیہ میں اس خوبی کے ساتھ لکھا کہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا کہ جس کی سفر و حضر میں دیکھنے کی ضرورت نہ ہو۔ علم تفسیر میں کتاب "تفسیرِ ربح سامانی" اور کتاب "تفسیرِ نور بخشیہ" تصنیف فرمائی اور کتاب "ارشاد الاخوان" اوراد و اشغالِ مشائخ چشت اہل بہشت میں تصنیف فرمائی اور ایک رسالہ بحثِ "وحدۃ الوجود" میں لکھا، یہ ایک نایاب رسالہ ہے جس میں "سرِّ ہمہ اوست" کو بہ دلائل احادیث و تفسیر تحریر فرمایا اور رسالہ "تجویزیہ" در جواز بر لعن یزید جون پور میں علما کے مباحثہ کے بعد تحریر فرمایا اور موافقِ عقیدۂ صاحب شرحِ عقائد نسفی یزید پر لعنت فسقی کہنا جائزہ ثابت کیا اور کتاب "بحر الحقائق" میں معرفت و حقیقت کے اسرار و رموز بیان فرمائے۔ علم نحو میں "نحوِ اشرفیہ" تصنیف فرمایا جس میں تمام مسائل نحوی بالتفصیل درج فرمائے۔ نیز کتاب "کنز الدقائق" تصوف میں تصنیف فرمائی اور رسالہ "بشارۃ المریدین" حسبِ درخواست سلطان ابراہیم شرقی جون پور میں تصنیف کیا اور "رسالہ غوثیہ" ذکرِ مردان اہل خدمات ابدال و اوتاد و غوث و قطب وغیرہ میں تصنیف کیا۔ "رسالہ قبریہ" اپنی قبر شریف میں لکھا جس میں حالاتِ نزولِ ملائکہ، اظہار اپنے عقائدِ حقہ اور بشارتِ عالمِ غیب تحریر فرمایا اور علم اصول میں "فصولِ اشرفی" لکھی۔ ایک جلد "مکتوباتِ اشرفی" آپ کے صاحبِ سجادہ حضرت نور العین نے جمع کی۔ "مرقوماتِ اشرفی" حضرت مولانا نظام الدین یمنی حضرت کے خلیفہ نے جمع کیا۔ ایک جلد "رقعاتِ اشرفی" جس کو حضرت مولانا شیخ محمد دُرّ یتیم نے جمع کیا تھا۔ اس میں مختصر رقعاتِ حضرت محبوب یزدانی درج کیے گئے ہیں اور "دیوانِ اشرف" ایک مبسوط کتاب منظوم ہے، جس کو اہلِ زمانہ مثلِ دیوانِ حافظ شیرازی مانتے ہیں۔"

(تحائفِ اشرفی، حصہ اول، ص 115 تا 118، ناشر: ادارہ فیضانِ اشرف دار العلوم محمدیہ، ممبئ)

اس اقتباس سے حضرت مخدوم اشرف کی کثرتِ تصانیف کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بات دوٹوک کہی جا سکتی ہے کہ سید اشرف جہانگیر سمنانی اردو کے پہلے مصنف تھے اور اخلاق و تصوف کے موضوع پر آپ کا یہ رسالہ اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ درجنوں سمیت اردو کے ایک درجن کے قریب محققین و مؤلفین کے اقوال و آرا ہمارے دعویٰ کی تائید و توثیق کے لیے کافی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆



اسلامی تصورِ استخلاف اور سرکلر اکانومی
وسائل کے اسراف اور پائیدار ترقی کا تقابلی و تجزیاتی مطالعہ

از: نبیل غزالی، شعبہ بزنس مینجمنٹ نجم الدین اربکان یونیورسٹی، قونیہ، ترکیہ

متفرقات

کائنات کا مادی اور معاشی نظام اس وقت تاریخ کے ایک انتہائی نازک، فیصلہ کن اور تشویشناک موڑ پر کھڑا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں پر محیط سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی بے مہار ہوس، مادیت پرستی اور صارفیت (Consumerism) نے کرہ ارض کے قدرتی وسائل کو جس بے دردی سے نچوڑا ہے، اس نے انسانیت کے مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ جدید مغربی معیشت جس بنیادی فلسفے پر استوار رہی ہے، اسے معاشی اصطلاح میں "خطی معیشت (Linear Economy) "کہا جاتا ہے۔ اس کا اصول انتہائی سادہ مگر تباہ کن ہے: "لو، بناؤ اور پھینک دو(Take, Make, Dispose) "۔ یعنی زمین سے خام مال نکالو، اس سے اشیاء تیار کرو، اور استعمال کے بعد انہیں کوڑے کے ڈھیر (Landfills) کی نذر کر دو۔ اس استحصالی طرزِ عمل نے نہ صرف عالمی حدت (Global Warming) اور ماحولیاتی آلودگی کو جنم دیا، بلکہ وسائل کے تیزی سے ختم ہونے (Resource Depletion) کا ایک ایسا سنگین بحران پیدا کر دیا کہ بالآخر مغربی مفکرین اور عالمی معاشی اداروں کو اپنی بقا کی خاطر ایک نئے معاشی ماڈل کی طرف رجوع کرنا پڑا، جسے آج کی جدید علمی اور کارپوریٹ دنیا میں "سرکلر اکانومی (Circular Economy) "یا 'دائری معیشت' کہا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں کے روایتی علمی و دینی حلقوں میں اس جدید معاشی اصطلاح کا تعارف ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے، اس لیے ایک محقق اور مفتی کے لیے اس کے تکنیکی پہلوؤں اور شرعی انطباق کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ سرکلر اکانومی دراصل اس معاشی ڈھانچے کا نام ہے جس میں اشیاء کی پیداوار اور کھپت کا نظام اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ کوئی بھی چیز استعمال کے بعد 'کچرا' یا 'فضلہ' نہ بنے، بلکہ اسے دوبارہ کارآمد بنا کر معاشی دائرے (Economic Loop) میں واپس لے آیا جائے۔ اس کے بنیادی ستونوں میں ریڈیوس - Reduce) کم استعمال)، ری یوز - Reuse) دوبارہ

استعمال(،ری سائیکل - Recycle) تجدید(،اور ری جنریٹ - Regenerate) قدرتی نظام کی بحالی (شامل ہیں۔اس کا ہدف یہ ہے کہ مصنوعات کی عمر طویل ہو اور قدرتی وسائل کا کم سے کم انخلاء ہو۔

اس جدید تصور کی اہمیت کا اندازہ ان چشم کشا عالمی اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے جو عالمی تحقیقی اداروں نے پیش کیے ہیں۔ نیدرلینڈز کے معروف تحقیقی ادارے 'سرکل اکانومی' کی "سرکلیرٹی گیپ رپورٹ 2024 (Circularity Gap Report 2024" (کے مطابق، اس وقت پوری دنیا کی معیشت محض 7.2 فیصد سرکلر (دائری) ہے، یعنی ہم زمین سے سالانہ 100 بلین ٹن سے زائد خام مال نکالتے ہیں اور اس کا 90 فیصد سے زیادہ حصہ استعمال کے بعد ضائع کر دیتے ہیں۔ عالمی بینک (World Bank) کی رپورٹ کے مطابق، دنیا بھر میں سالانہ 2.01 بلین ٹن ٹھوس فضلہ (Solid Waste) پیدا ہوتا ہے، جس میں سے بمشکل 13 سے 14 فیصد ری سائیکل ہوتا ہے۔ ورلڈ اکنامک فورم (WEF) اور ایلن میک آرتھر فاؤنڈیشن (Ellen MacArthur Foundation) کی مشترکہ تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ اگر دنیا خطی معیشت کو ترک کر کے سرکلر اکانومی کو اپنا لے، تو نہ صرف سالانہ 4.5 ٹریلین ڈالرز کی معاشی بچت ہو سکتی ہے، بلکہ 2050 تک عالمی گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں 39 فیصد تک کمی لائی جا سکتی ہے۔ یورپین یونین نے اپنے "سرکلر اکانومی ایکشن پلان" کے تحت 2030 تک اپنے تمام پیکیجنگ میٹریل کو ری سائیکل ایبل بنانے کا قانون پاس کیا ہے جس سے لاکھوں ٹن پلاسٹک اور دھاتوں کو ضائع ہونے سے بچایا جا رہا ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ وسائل کے تحفظ، عدم اسراف اور پائیدار ترقی کا یہ تصور مغرب کی جدید سائنسی اور معاشی تحقیق کا ثمر ہے، لیکن جب ایک اسلامی محقق اور فقیہ ان جدید دعوؤں کو شریعت کے عدسے سے دیکھتا ہے، تو یہ حیرت انگیز اور ایمان افروز حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مغرب آج جس سرکلر اکانومی کو اپنی بقا کا ضامن سمجھ کر اپنا رہا ہے، اسلام نے چودہ صدیاں قبل "تصورِ استخلاف" اور "عدمِ اسراف" کے الہامی اصولوں کے ذریعے اس کی بنیاد رکھ دی تھی۔

اسلام کا معاشی اور ماحولیاتی فلسفہ سرمایہ دارانہ نظام کے "مطلق ملکیت (Absolute Ownership) "کے تصور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ قرآنِ مجید کے مطابق زمین اور اس کے تمام وسائل کا حقیقی مالک صرف اللہ رب العزت ہے، جب کہ انسان کی حیثیت اس زمین پر ایک امین اور نائب (خلیفہ) کی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت 30 (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) اسی عظیم "تصورِ استخلاف" کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس تصور کے تحت ایک مسلمان تاجر، صنعت کار یا عام صارف کو وسائل کے بے دریغ استعمال کا قطعی حق حاصل نہیں، بلکہ اس کی ملکیت "ملکیتِ مقیدہ (Restricted Ownership) "ہے۔ شریعت نے وسائل کو ضائع کرنے سے اس سختی سے روکا ہے جس کی نظیر آج کے کسی جدید مغربی قانون میں نہیں ملتی۔ سرکلر اکانومی کا پہلا اصول 'Reduce' (وسائل کا کم استعمال) ہے، جسے اسلام نے 'اسراف' اور 'تبذیر' کی حرمت کے ذریعے نافذ کیا ہے۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم الشان اور کائناتی اصول کہ "وضو کرتے ہوئے بھی پانی میں اسراف نہ کرو، خواہ تم کسی بہتی ہوئی نہر کے کنارے ہی کیوں نہ بیٹھے ہو" (سنن ابن ماجہ)، دراصل پائیدار ترقی (Sustainable Development) کا وہ اعلیٰ ترین اور حتمی معیار ہے جس تک آج کی ماحولیاتی سائنس پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مغرب میں سرکلر اکانومی کا محرک مادی فائدہ یا ماحولیاتی خوف ہے، لیکن اسلام میں وسائل کا تحفظ عقیدے، روزِ قیامت کے احتساب اور عبادت کا حصہ ہے۔

اگر ہم فقہِ اسلامی اور تاریخِ اسلام کے اوراق الٹیں تو یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ قرونِ اولیٰ اور بعد کے اسلامی ادوار میں مسلم معاشروں نے سرکلر اکانومی کی عملی صورتیں اس وقت نافذ کر دی تھیں جب یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ فقہِ حنفی کی معرکہ الآراء کتب میں "احیاء الموات" (مردہ یا بنجر زمینوں کو آباد کرنا) کا پورا ایک باب موجود ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے شاگردوں نے بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے والوں کے لیے جو مالکانہ حقوق کے احکام وضع کیے، وہ دراصل زمین (جو کہ سب سے بڑا قدرتی وسیلہ ہے) کو ضائع ہونے سے بچانے اور اسے دوبارہ معاشی دائرے (Regenerate) میں لانے کی ہی فقہی شکل ہے۔ اسی طرح، اسلامی تاریخ میں "نظامِ وقف" نے سرکلر اکانومی کا ایک ایسا شاندار ماڈل پیش کیا جو آج کے ترقی یافتہ ممالک کے لیے بھی باعثِ حیرت ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں ایسے اوقاف قائم کیے گئے جن کا مقصد ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنا، زخمی اور بوڑھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنا، اور شہر کے فضلہ کو ٹھکانے لگانا تھا۔ یہ نظام اشیاء کو فوری طور پر تلف کرنے کے بجائے ان کی عمر (Lifespan) بڑھانے کا عملی مظاہرہ تھا۔ خلافتِ عباسیہ کے دور میں بغداد میں دنیا کا پہلا کاغذ کا کارخانہ قائم ہوا، جس میں پرانے کپڑوں، رسیوں اور درختوں کی چھال کو باقاعدہ 'ری سائیکل' کر کے بہترین معیار کا کاغذ تیار کیا جاتا تھا، جس نے علم کی ترویج کے ساتھ ساتھ وسائل کے بھرپور اور پائیدار استعمال کی ایک لاثانی مثال قائم کی۔ اسی طرح اندلس (اسپین) اور مشرقِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ آبی گزرگاہیں (Aqueducts) اور 'قنات' کا نظام زیرِ زمین پانی کو ضائع کیے بغیر استعمال کرنے اور اسے دوبارہ زراعت کے لیے ری سائیکل کرنے کا وہ عظیم انجینئرنگ اور معاشی شاہکار تھا جسے آج کے ماہرین آبی وسائل کے پائیدار انتظام (Sustainable Water Management) کی بہترین مثال مانتے ہیں۔

ان تاریخی اور فقہی حقائق کی روشنی میں، آج کے دور کے علماء کرام، مفتیانِ عظام اور محققین پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ صرف روایتی 'فقہ البیوع' (خرید و فروخت کے مسائل) تک محدود نہ رہیں، بلکہ جدید کارپوریٹ دنیا کے سپلائی چین میکانزم، خام مال کے استخراج، اور ماحولیاتی اثرات کو بھی اپنے فتاویٰ اور تحقیقات کا حصہ بنائیں۔ جب کوئی جدید کارپوریٹ ادارہ اپنے منافع کے لیے فیکٹریوں کا زہریلا فضلہ دریاؤں میں بہاتا ہے، یا جان بوجھ کر ایسی مصنوعات بناتا ہے جو جلدی خراب ہو

جائیں (Planned Obsolescence) تاکہ ان کی فروخت بڑھے، تو فقہِ اسلامی کا مشہور اور متفق علیہ قاعدہ "لا ضرر ولا ضرار" (نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچاؤ) پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آتا ہے۔ ایک مفتیِ کامل کی نگاہ صرف اس بات پر نہیں ہونی چاہیے کہ بیع کا ایجاب و قبول درست ہوا یا نہیں، بلکہ شریعت کے مقاصد (حفظِ مال اور حفظِ نسل) کا تقاضا ہے کہ اس بات پر بھی حکمِ شرعی نافذ کیا جائے کہ اس پیداواری عمل سے معاشرے اور آنے والی نسلوں کے قدرتی وسائل کس حد تک تباہ ہو رہے ہیں۔ اسلام کا نظامِ معیشت سرمایہ داری کے خطی ماڈل (Linear Model) کو یکسر مسترد کرتا ہے اور ایک ایسے دائری ماڈل (Circular Model) کی وکالت کرتا ہے جو امانت، دیانت، عدمِ اسراف، اور استخلاف کے الہامی اصولوں پر استوار ہو۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعات اور مدارس کے محققین، جدید ماہرینِ معاشیات اور انوائرنمنٹل سائنسدانوں کے ساتھ مل کر اسلام کے اس ماحولیاتی اور معاشی فلسفے کو ایک قابلِ عمل قانون اور کارپوریٹ پالیسی کی صورت میں عالمی فورمز پر پیش کریں۔ یہی وہ فکری، تحقیقی اور فقہی بصیرت ہے جو نہ صرف جدید معاشی چیلنجز کا شافی حل پیش کر سکتی ہے، بلکہ اسلام کی آفاقیت، جامعیت، اور اس کے مقاصدِ عالیہ کی برتری کو جدید علمی اور تحقیقی دنیا میں ایک مسلمہ اور ناقابلِ تردید حقیقت کے طور پر منوا سکتی ہے۔



جدید لسانیات کا پُر پیچ ڈھانچہ اور مذہبی متجدّدین کا مکر

از: مولانا پٹیل عبد الرحمٰن مصباحی، گجرات (انڈیا)

متفرقات

جدیدیت نے استدلال کے باب میں جو ایک خاص نوع کا اثر ڈالا ہے، وہ یہ ہے کہ الفاظ کو یا تو سیاق و سباق سے الگ کر لیا گیا ہے یا ان کے پس منظر کو کالعدم مان لیا گیا ہے. اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی کلام کا کوئی حتمی حقیقی مفہوم نہیں رہ جاتا بلکہ اس میں ایک تعمیم آ جاتی اور ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے کہ ہر پڑھنے یا سننے والا اپنے مطلب کی بات نکال سکے یا اپنے موافق یا مد مقابل کے مخالف مراد بیان کر سکے. یوں ہی ایک زمانی و مکانی عموم بھی در آتا ہے کہ ہر زمانے کا ہر خطے کا شخص اپنے گرد و پیش اور حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک ہی جملے کا الگ الگ بلکہ بسا اوقات متضاد مفہوم بیان کر سکتا ہے اور ایسے میں کسی کو اس پر بے جا تاویل یا مجاز کی طرف کھینچ تان کر لے جانے کا اعتراض اٹھانے کی اجازت بھی نہیں ہوتی اس لیے کہ جب کوئی سیاق و سباق نہیں کوئی پس منظر نہیں تو کوئی تحدید نہیں کوئی مانع نہیں، ہر راہ درست اور ہر موڑ منزل .

جدید دور کے تمام بیانیے مذکورہ خاص انداز پر دیدہ و دانستہ مطلق رکھے جاتے ہیں. آج کی دنیا میں با قاعدہ ایک ایسا اسلوب موجود ہے جو غیر متعین مفاہیم کی ترویج بلکہ تولید کرتا ہے. ہر بحث ہر اعلان ہر اعلامیہ ہر معاہدہ اور ہر سیاسی یا بین الاقوامی موقف بلکہ جدید مذہبی تشریحات کے بڑے حصے کو اسی اسلوب میں تیار کیا جاتا پھر نشر کیا جاتا ہے، اور موقع آنے پر الگ الگ اوقات میں الگ الگ جگہوں کے لحاظ سے اس کا مختلف مفہوم بیان کیا جاتا ہے یا گڑھ لیا جاتا ہے، بالکل اسی مطلوبہ نتیجے کے لیے جس کو اخذ کرنے کی آزادی بر قرار رکھنے کے لیے ہر طرح کے سیاق و سباق سے عاری اور کسی بھی قسم کے پس منظر سے خالی کلام کی بنا ڈالی گئی تھی. یہ دورِ جدید میں وضع کی گئی لفظوں کی وہ بازی گری ہے جس میں لفظ اپنے معانی کا تعین نہیں کرتا بلکہ من مرضی کا معنی تراش کر لفظ کو اس کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے، چاہے وہ لفظ کے قد سے میل کھاتا ہو یا نہ کھاتا ہو، کبھی نہایت تنگ کبھی ضرورت سے

زیادہ کشادہ، غرض کہ کسی بھی درجے کا کیسا ہی معنیٰ ضرورت پڑنے پر ایک لفظ کے اندر سے نکال لیا جاتا ہے، مانو! لفظ لفظ نہ ہو کوئی غیر متعین راستے والی سرنگ ہو، جس کا کوئی سرا کہیں بھی نکل سکتا ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ اسلوب ایوانوں سے لے کر ناولوں تک ہر جگہ رائج ہے اور سیاسی گلیاروں سے لے کر معاشی منڈیوں تک اسی کا بول بالا ہے ۔

مذکورہ پیچیدہ لگنے والی بات کو ایک مثال کے تحت ملاحظہ کرتے ہیں تاکہ آسانی ومانوسیت دونوں پیدا ہو سکے۔ مثال کے طور پر کسی جدید لیڈر کا یہ اعلان کہ "ہم علاقے میں امن قائم کرنا چاہتے ہیں چاہے ہمیں اس کے لیے کسی بھی حد تک جانا پڑے یا اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔" یہ بظاہر ایک قانونی کاروائی اور اس کے نفاذ کا سادہ سا اعلان ہے، مگر اس میں استعمال کی گئی زبان جدید ہے، اس کا مطلب ہے کہ علی الاطلاق اس سے کسی خاص وقت میں کچھ بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یہاں کئی پہلو سے پیچیدگی ہے جسے زبان کے پر فریب استعمال نے منظر سے غائب کر دیا ہے۔ امن قائم کرنے سے مراد کیسا امن، ایسا امن جس میں کوئی فریق بھی ہتھیار بند نہیں ہوگا یا ایسا امن جس کو قائم صرف ایک فریق کرے گا دوسرے پر ہر طرح کے تشدد کے ذریعے، یہ بات گول کر دی گئی۔ اسی طرح علاقہ کس کا اپنا یا فریق مخالف یا دونوں کا مشترکہ، اگر مشترکہ ہے تو امن سے مراد فریق مخالف کا انخلاء ہے یا اسے قانونی دباؤ کے ذریعے مشترکہ علاقے میں دوسرے درجے کا شہری بنا دینا۔ اسی طرح کسی بھی حد تک جانے اور کوئی بھی قیمت چکانے کے الفاظ کیا بتلا رہے ہیں یا کیا چھپا رہے ہیں، یہ بھی واضح نہیں، کسی بھی حد تک کے الفاظ میں ہر وہ جانی مالی تشدد شامل ہے جو کھلم کھلا یا پردہ خفا میں یا نہایت خفیہ طریقے سے کیا جائے گا اور وہ اپنی تمام تر حیوانیت کے باوجود قانونی جواز کے دائرے میں آئے گا۔ قیمت چکانے سے مراد یہ کہ فریقِ مخالف اگر مزاحمت پر اتر آئے تو یہ ہمارے ظلم کی دلیل نہیں بنے گی بلکہ ہماری مظلومیت کی علامت ہوگی، یعنی تمام تر تشدد کے بعد بھی فریق مخالف زیر نہ ہو تو مزید تشدد کا جواز پیدا کرنے کے لیے قیمت چکانے کے الفاظ لائے جاتے ہیں ۔

یہ ہے وہ مفاد جو جدید لسانیات سے حاصل کیا جاتا ہے، جدید زبان ایک ایسا لُغوی ڈھانچہ ہے جو ہر طرح کے سیاق وسباق سے پاک ہے تاکہ اس کے ذریعے موافق ومخالف دونوں محاذ اپنے زیر اثر رکھے جا سکیں۔ ضرورت پڑنے پر دو طرح کے بلکہ کئی طرح کے مفاہیم تراشے جا سکیں اور الگ الگ راہیں نکال کر ہر ایک کو صحیح قرار دیا جا سکے۔ درج بالا مثال ایک بہت سادہ سی جزوی مثال ہے، اس کی روشنی میں بہت دور تک جدید زبان کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ جدید دور کا یہ لسانیاتی عمل کسی کی بھی عبارت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعے مطلوبہ مفاہیم تراشے جا سکتے ہیں، جب جدید ذہن کا کوئی مفکر ایسا کرتا ہے تو قدیم ترین ماخذ سے اپنا جدید ترین مفہوم بے تکلف (بظاہر ہی سہی) وضع کر لیتا ہے اور فریق دیگر کو قائل بھی کر لیتا ہے کہ یہی وہ درست مفہوم ہے جس سے تم سب نا آشنا تھے۔ یہ استعمال کسی جدید شخصیت یا جدید تحریر کے ساتھ خاص نہیں، یہ ایک مچھلی پکڑنے کے پھندنے جیسا ہے جسے تالاب سے لے کر سمندر تک ہر جگہ یکساں طور پر شکار کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ارسطو کا ایک جملہ یا

ڈارون کا ایک جملہ یا مارکس کا ایک جملہ یا خاص اسلامی تناظر میں شیخ ابن عربی کا کوئی قول یا حضرت عمر کا کوئی قول. کچھ بھی اپنے موافق یا فریق مخالف کے خلاف لایا جاسکتا ہے، سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر، مجرد الفاظ دکھلا کر، من پسند مفہوم میں ڈھال کر .

جدید دور کے آغاز میں یہ لسانیاتی جوڑ توڑ پہلے پہل اہلِ استشراق نے وضع کیا، پھر اہل استعمار نے اس کے عملی فوائد حاصل کرنے کی خوفناک سیاست کی، اور اس کے نتیجے میں جدید معاشرے کی زبان پیدا ہوئی. جدید دور میں ادبی متجدّدین نے اپنی زبان یہیں سے اخذ کی یا دوسرے لفظوں میں کہیں تو یہیں سے نئی بولی نیا اسلوب سیکھا، بالآخر ہر چہار جانب اسی زبان کا بول بالا ہوا یہاں تک کہ مذہبی متجددین نے بھی اپنے لیے اسی جدید لسانی ڈھانچے کو مناسب جانا. ادبی متجددین کا میدان چوں کہ کھلا میدان تھا اس لیے مذہبی تنقید تو وہاں در آئی مگر براہ راست مذہبی نصوص سے چھیڑ چھاڑ کا کوئی خاص ماحول پیدا نہ ہو سکا، اس کے بر خلاف مذہبی متجددین چوں کہ اپنے آپ کو خاص دین کے میدان کا کھلاڑی سمجھتے تھے اس لیے جب انہوں نے یہ نیا ڈھنگ سیکھا تو براہ راست اسے دین کے نصوص یعنی کتاب وسنت پر لاگو کر کے نتائج حاصل کرنا شروع کر دیا. دین کی تفہیم کے نام پر شروع کی گئی اپنی نئی کوشش کے لیے متجددینِ زمانہ نے اِسی جدید لسانیات کے سہارے پرانے اجتہاد کے اصول کو مجرد کر کے اپنے موافق بناڈالا، یوں یہ مذہبی متجددین جو حقیقت میں مغرب کی جدید لسانیات پھر جدید سماجیات کے مقلدِ محض تھے وہ (اپنی مجرد تشریحات کے زور پر) دینی امور کے مجتہد بن بیٹھے .

مذہبی متجددین مذہبی متون یا ان کی تشریحات کے ساتھ یہی جدید لسانیاتی عمل کرتے ہیں. چاہے براہ راست وحی کے الفاظ ہوں یا اس کی تشریح میں کہے گئے پیغمبر کے کلمات یا ان کے وارث علماء کے اقوال، سب کو ان کے سیاق وسباق سے کاٹ لیا جاتا ہے یا کم درجے میں آیت کے سببِ نزول یا حدیث کے سببِ ورود یا قولِ عالِم کے سببِ وقوع کو نظر انداز کر کے محض چنندہ الفاظ کو لے لیتے ہیں، پھر اس پر اپنے مفاہیم کی وہ عمارت کھڑی کر لیتے ہیں جو سیدھی بنیاد پر ٹیڑھی دیوار کھڑی کرنے کے مترادف ہوتی ہے. ایسا کرنے سے ایک عام موقع بن جاتا ہے مفاہیم کو وضع کرنے کا، الگ الگ مقام پر الگ الگ انداز سے چسپاں کرنے کا اور ہر مرتبہ نئی تشریح پر اپنی پیٹھ تھپتھپانے کا .

اِس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ تقریباً تمام متجددین فہمِ نصوص میں اس بات کے دعوے دار ہیں کہ ؛؛ پہلے کلام کے ہر ایک کلمہ کا معنی سمجھا جائے پھر ہر کلمہ کے معنی کے سہارے پورے کلام کی ترکیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے مجموعی معنی کی تعیین کی جائے ؛؛ یہ جو قدیم طریق ہے وہ درست نہیں ہے، درست نہ ہونے کی ایک خوبصورت مگر بہت بھونڈی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے روایتی علماء نصوص کی افادیت کو محدود کر کے ایک عام مسلمان کے لیے دائرۂ فہم بلکہ دائرۂ عمل تنگ کر دیتے ہیں، اس کی جگہ (متجددین کے مطابق) ہونا یہ چاہیے کہ پورے کلام مثلاً ایک آیت یا ضرورت پڑے تو ایک رکوع کے مجموعی ماحول کو سمجھا جائے پھر اس مجموعی فضا کے لحاظ اس میں درج کلمات کے معانی کا تعین کیا جائے، یوں ہمارے لیے بیک وقت مختلف مفاہیم کے بیان کی اور متنوع اعمال کو بجالانے کی وسعت پیدا ہو جائے گی. قصہ مختصر یہ کہ

اگر فہم نصوص کے روایتی طریق کو چھوڑ دیا جائے تو نئے دور میں ہم سائنسی ماحول میں پروان چڑھنے والے مشرق و مغرب کے اذہان کو بہت کچھ نیا دے سکتے ہیں۔

اِس ضمن میں یہاں ایک جملہ لیجیے اور اس کے لسانیاتی خد و خال کو کرید کر دیکھیے۔ متجددین عموماً بڑی روانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں کہ "ہمیں اسلام کا وہ تصور پیش کرنا ہوگا جو نئے ترقی یافتہ ماحول میں پروان چڑھنے والے سائنسی ذہن کو اپیل کر سکے تب ہم اپنی تبلیغی مساعی میں کامیاب ہوں گے۔" اِس بظاہر خیر خواہی سے بھرپور جملے میں یہ واضح نہیں کہ اسلام پیش کرنا ہے یا اس کا کوئی مخصوص یا مطلوب تصور پیش کرنا ہے، یہ بھی مذکور نہیں کہ نئے ماحول کی کیا تعریف ہے اور ترقی یافتہ ہونے کا کیا مطلب ہے، پھر یہ پہلو بھی غائب ہے کہ نئے اور ترقی یافتہ ماحول میں پلے ہوئے ذہن ہی کے لیے یہ پیش کش کیوں، ہر ایک کے لیے کیوں نہیں، کیا اسلام میں ایسی تبلیغ کی گنجائش ہے جس میں خاص طبقے کو خاص سلیقے پر دین بتلایا جائے؟ مزید غور کریں تو یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ اگر یہ سب کچھ کر دیا جائے تو تبلیغ کامیاب ہو جائے گی مگر تراشیدہ عبارات میں ظاہر ایسے کیا جاتا ہے کہ بس ایسا تصور پیش کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد تو آناً فاناً دنیا مسلمان۔ یہ خاص قسم کی لسانیت ہی ہے جو متجددین کی بعید از کار تدابیر کو حتمی حل بنا کر دکھاتی ہے اور اپنی تمام تر پیچیدگی کو کامیابی کے ساتھ قاری کی نظر سے اوجھل رکھنے کا موقع تلاش لیتی ہے۔

ہمارا نیا طالب علم جو لسانیات کے بنیادی اصولوں سے غافل ہے اور جدید لسانیات کے تو نام سے بھی ناواقف ہے، بھلا وہ متجددین کی ایسی پیچیدہ بلکہ پر فریب لسانی کارروائیوں کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ مدارس کا پروردہ نیا ذہن بس حسنِ عبارت کو سحر سمجھ بیٹھا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ حُسن نہیں میک اپ ہے، چہروں کی طرح عبارات کا میک اپ، حقائق کو چھپانے والا یا بدلنے والا، دھندلا کرنے والا یا گہرا کرنے والا۔ آج کل مذہبی حلقوں میں یا مذہبی مواد پڑھنے والے حلقوں میں متجدّدین کا مواد پڑھنے کے بعد پہلا تاثر یہ آتا ہے کہ یہ بڑا پر لطف انداز ہے، روایتی علماء کے اسالیب میں وہ بانکپن نہیں، حالانکہ اس بات کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا جائے تو آسانی سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ اسلاف کا اسلوب کم مسحور کُن لگنے کی دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ ہماری متعلقہ فن سے دلچسپی بہت کم ہے لہٰذا فنی استعارے ہمارے لیے لطف کی جگہ وبال پیدا کرتے ہیں، دوسری یہ کہ اسلاف کے اسلوب میں حقائق کا بیان اور قاری تک ان کو بعینہ منتقل کرنا مقصود ہے، سو ان کے الفاظ فطری ہیں بات سیدھی سَٹیک ہے، اس کے بر خلاف جب نئے اسالیب اپنانے والے متجددین کا مقصود ہی حقائق گھڑنا یا قاری کے رخ کو حقائق سے موڑ کر مطلوبہ ذہن سازی کرنا ہو تو سارا زور عبارات کے حسن اور ان کی دلچسپ پیچیدگی پر دیا جاتا ہے، ایسے میں ایک طالب کا یہ دھوکا کھا جانا بعید نہیں کہ متجدّدین کا اسلوب بڑا زرخیز ہے اور روایتی اسلایب تھوڑے سے خشک۔ کمال تو یہ ہے کہ اُس خشکی میں تحمل، فن آشنائی اور مفہوم شناسی کے تین قطرے ٹپکا کر اگر طالب دوبارہ نظر آزمائی کرے تو آج بھی یہ خشک اسلوب کی مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

خلفائے راشدین کا نظامِ حکومت

از: مفتی نازش مدنی مجددی، مرادآباد

متفرقات

اسلامی ریاست کا روشن اور مثالی نمونہ

اسلام صرف عبادات وعقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ اجتماعی اور سیاسی زندگی کے اصول بھی عطا فرمائے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک ایسی اسلامی ریاست قائم فرمائی جس کی بنیاد عدل، مساوات، اخوت، دیانت اور خوفِ خدا پر تھی۔ حضور اقدس ﷺ کے وصالِ ظاہری کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی نظام کو آگے بڑھایا اور خلفائے راشدین کے مبارک دور میں اسلامی حکومت اپنی کامل شان کے ساتھ دنیا کے سامنے آئی۔ یہی زمانہ تاریخ اسلام میں "خلافتِ راشدہ" کہلاتا ہے، جسے خود نبی کریم ﷺ نے بھی ہدایت یافتہ خلافت قرار دیا۔ خلفائے راشدین سے مراد حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا پورا حق ادا فرمایا۔ منہاج نبوت پر خلافت راشدہ تیس سال رہی کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالی عنہ کے چھ مہینے پر ختم ہوگئی۔ ان مقدس حضرات کے دورِ حکومت میں جو اصول نافذ ہوئے وہ قیامت تک آنے والے حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ آج جب دنیا مختلف سیاسی ومعاشی بحرانوں کا شکار ہے، ایسے وقت میں خلافتِ راشدہ کا نظام انسانیت کے لیے بہترین نمونہ بن کر سامنے آتا ہے۔

خلافتِ راشدہ کی بنیاد:

خلفائے راشدین کے نظام حکومت کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بنیاد قرآن وسنت پر قائم تھی۔ حکمران اپنی مرضی یا ذاتی خواہش کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے بلکہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو مقدم رکھتے تھے۔ خلافت دراصل ایک امانت تھی، نہ کہ بادشاہت یا شخصی اقتدار۔ خلیفۂ وقت خود کو امت کا خادم سمجھتا تھا۔ حضرت

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالتے وقت جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ اسلامی طرزِ حکومت کا عظیم منشور ہے۔
آپ نے فرمایا:
" تم میں کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلا دوں، اور تم میں طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق لے لوں۔"
حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا اصل مقصد عدل کا قیام اور مظلوم کی مدد تھا۔

عدل و انصاف کا بے مثال نظام:

خلفائے راشدین کے نظامِ حکومت کا سب سے نمایاں وصف عدل و انصاف تھا۔ اسلامی ریاست میں امیر و غریب، حاکم و محکوم اور عربی و عجمی سب قانون کی نظر میں برابر تھے۔ کسی شخص کو اس کے نسب، دولت یا منصب کی وجہ سے فوقیت حاصل نہ تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں عدل و انصاف اپنی معراج پر نظر آتا ہے۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی بھوک سے مر جائے تو قیامت کے دن عمر سے اس کے بارے میں سوال ہو گا۔ یہی احساسِ ذمہ داری اسلامی حکومت کی اصل روح تھا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک شخص کو ناحق مارا۔ وہ شخص شکایت لے کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے اسی طرح بدلہ دلوایا اور فرمایا: "تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا؟" یہ وہ انصاف تھا جس نے دنیا کو حیران کر دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں رعایا خود کو محفوظ اور باوقار محسوس کرتی تھی۔

شوریٰ اور باہمی مشورے کا نظام:

اسلامی حکومت آمریت پر نہیں بلکہ مشورے پر قائم تھی۔ قرآنِ کریم نے اہلِ ایمان کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:
"وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" یعنی ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے پاتے ہیں۔
خلفائے راشدین اہم معاملات میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ جنگ، معیشت، عدلیہ اور انتظامی امور میں اہلِ علم و تقویٰ سے رائے لی جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ مجلسِ شوریٰ قائم فرمائی تھی جس میں اکابر صحابہ شریک ہوتے تھے۔ اس نظام کا فائدہ یہ تھا کہ فیصلے کسی ایک فرد کی خواہش کے بجائے اجتماعی دانش کے مطابق ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور کے فیصلوں میں حکمت، اعتدال اور دور اندیشی نمایاں نظر آتی ہے۔

حکمرانوں کی سادگی اور خوفِ خدا:

آج دنیا میں اقتدار کو عیش و عشرت اور شاہانہ زندگی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، مگر خلفائے راشدین کی زندگیاں انتہائی سادہ تھیں۔ ان کے لباس، خوراک اور رہن سہن میں کوئی تکلف نہ تھا۔ وہ بیت المال کو ذاتی ملکیت نہیں بلکہ امت کی امانت سمجھتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت کے بعد بھی تجارت کے لیے نکل پڑے تا کہ اہل و عیال کی ضروریات پوری کر

سکیں۔ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اب آپ پوری امت کے کاموں میں مشغول رہیں گے، لہٰذا بیت المال سے بقدرِ ضرورت وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لباس پر پیوند ہوتے تھے۔ راتوں کو مدینہ کی گلیوں میں گشت کرتے تاکہ عوام کے حالات معلوم کر سکیں۔ ایک مرتبہ ایک خیمے سے بچوں کے رونے کی آواز سنی۔ معلوم ہوا کہ کئی دن سے فاقہ ہے۔ آپ فوراً بیت المال گئے، کندھے پر آٹے کی بوری اٹھائی اور خود کھانا پکا کر بچوں کو کھلایا۔ یہی وہ حکمران تھے جن کے عدل سے دشمن بھی متاثر ہوئے۔

بیت المال اور معاشی نظام:

خلفائے راشدین نے مضبوط معاشی نظام قائم کیا۔ بیت المال ریاستی خزانہ تھا جس میں زکوٰۃ، صدقات، جزیہ اور دیگر محصولات جمع ہوتے تھے۔ اس مال کو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المال کا باقاعدہ نظام قائم فرمایا۔ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور معذوروں کے وظائف مقرر کیے گئے۔ فوجیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں اور سرکاری امور کے لیے نظم و ضبط پیدا کیا گیا۔ اسلامی حکومت کا مقصد صرف ٹیکس جمع کرنا نہ تھا بلکہ رعایا کی ضروریات پوری کرنا بھی تھا۔ اگر کسی علاقے میں قحط یا مصیبت آتی تو حکومت فوری امداد پہنچاتی تھی۔

عوامی خدمت اور فلاحِ عامہ :

خلفائے راشدین عوام کی خدمت کو عبادت سمجھتے تھے۔ سڑکیں تعمیر کی گئیں، کنویں کھدوائے گئے، مساجد اور مدارس قائم ہوئے اور مسافروں کے آرام کا انتظام کیا گیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ضرورت کے لیے "بئرِ رومہ" خرید کر وقف کر دیا۔ آپ کے دور میں مسجد نبوی کی توسیع ہوئی اور بحری فوج کا قیام عمل میں آیا۔ آپ کی سخاوت اور خدمتِ خلق بے مثال تھی۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی عدل و تقویٰ کی اعلیٰ مثالیں قائم فرمائیں۔ آپ نے ہمیشہ حق و انصاف کا ساتھ دیا، خواہ اس کے لیے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑی۔

مذہبی رواداری اور انسانی حقوق:

خلافتِ راشدہ میں غیر مسلموں کے حقوق کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ انہیں مذہبی آزادی حاصل تھی اور ان کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ داری تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس فتح ہونے کے بعد وہاں کے عیسائیوں کو مکمل تحفظ دیا اور ان کے عبادت خانوں کو محفوظ رکھا۔ یہی وہ عظیم اخلاق تھا جس کی وجہ سے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔ مسلمانوں کی فتوحات صرف تلوار کی قوت سے نہیں بلکہ کردار کی طاقت سے ہوئیں۔

نظامِ احتساب:

خلفائے راشدین خود کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ اگر کسی عام شخص کو بھی خلیفہ سے شکایت ہوتی تو وہ برملا اپنی بات کہہ سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ دورانِ خطبہ سوال کیا گیا کہ آپ کے پاس زائد کپڑا کہاں سے آیا؟ آپ نے ناراض ہونے کے بجائے وضاحت پیش کی۔ یہ احتساب کا وہ نظام تھا جس میں حکمران عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ یہی شفافیت اسلامی حکومت کی کامیابی کا راز تھی۔

خلافت راشدہ کے اثرات:

خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی ریاست نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے وسیع علاقوں تک پھیل گئی۔ ایران اور روم جیسی طاقتیں مسلمانوں کے سامنے شکست کھا گئیں، مگر مسلمانوں نے فتح کے بعد بھی ظلم و جبر کا راستہ اختیار نہ کیا بلکہ عدل و احسان سے کام لیا۔

اس دور نے ثابت کر دیا کہ جب حکمران نیک، دیانت دار اور خدا ترس ہوں تو معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ خلافتِ راشدہ دراصل اسلامی تعلیمات کی عملی تفسیر تھی۔ عصر حاضر میں خلافتِ راشدہ کی اہمیت آج دنیا ظلم، ناانصافی، بدعنوانی اور اخلاقی زوال کا شکار ہے۔ حکمران عوامی خدمت کے بجائے ذاتی مفادات میں مصروف ہیں۔ ایسے ماحول میں خلافتِ راشدہ کا نظام امید کی روشن کرن بن کر سامنے آتا ہے۔

اگر آج بھی حکمران خلفائے راشدین کے اصولوں کو اپنالیں، یعنی عدل، امانت، مشورہ، سادگی اور خوفِ خدا کو اپنی حکومت کی بنیاد بنائیں، تو معاشرے میں امن، خوش حالی اور انصاف قائم ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کا نظامِ حکومت انسانی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ یہ ایسا مثالی نظام تھا جس میں حکمران خادم، قانون سب کے لیے برابر، بیت المال امانت، اور عوامی خدمت عبادت سمجھی جاتی تھی۔ عدل و انصاف، دیانت، شوریٰ، مساوات اور تقویٰ اس حکومت کے بنیادی ستون تھے۔ آج امت مسلمہ کو ضرورت ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے ان روشن اصولوں کو دوبارہ اپنائے۔ یقیناً یہی وہ راستہ ہے جو دنیا و آخرت کی کامیابی، امن اور سربلندی کی ضمانت بن سکتا ہے۔

فکرِ آخرت اور اصلاحِ نفس

(حافظ) افتخار احمد قادری، کریم گنج، پورن پور، پیلی بھیت

انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ہر دور میں انسان نے اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھنے اور اپنی شخصیت کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ فلسفیوں نے عقل کی روشنی میں، مفکرین نے تجربات کی بنیاد پر اور مذاہب نے وحیِ الٰہی کی رہنمائی میں انسان کو اس کے مقام اور منزل سے آگاہ کرنے کی سعی کی ہے۔ تاہم ان تمام ذرائع میں اسلام وہ واحد جامع نظامِ حیات ہے جس نے انسان کو نہ صرف اس کی تخلیق کا مقصد بتایا بلکہ اسے دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کا راستہ بھی دکھایا۔ اسلام کی تعلیمات کا بنیادی جوہر یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو آخرت کی جواب دہی کے احساس کے ساتھ گزارے اور اپنے نفس کی مسلسل اصلاح کرتا رہے۔ یہی فکرِ آخرت اور اصلاحِ نفس کا وہ عظیم تصور ہے جو انسان کو حیوانیت سے انسانیت اور انسانیت سے عبدیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے۔

فکرِ آخرت دراصل اس یقین کا نام ہے کہ دنیا کی موجودہ زندگی عارضی اور امتحانی ہے جبکہ اصل اور دائمی زندگی موت کے بعد شروع ہوگی۔ انسان کا ہر قول و فعل، ارادہ و نیت محفوظ کی جارہی ہے اور ایک دن اسے اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ قرآن مجید بار بار اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ دنیا کی زندگی کھیل تماشے اور دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں جبکہ حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد فرمایا گیا کہ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ عقیدہ ایک نظری تصور نہیں بلکہ انسانی کردار سازی کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ جب انسان یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے تو اس کی زندگی میں ایک غیر معمولی سنجیدگی پیدا

ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے افعال و اعمال کا جائزہ لینے لگتا ہے، اپنی کوتاہیوں پر غور کرتا ہے اور اپنے نفس کو برائیوں سے روکنے کی کوشش کرتا ہے یہی کیفیت اصلاحِ نفس کہلاتی ہے۔

اصلاحِ نفس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے باطن کو اخلاقی اور روحانی بیماریوں سے پاک کرے، کردار کو سنوارے، اعمال کو درست کرے اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا پابند بنائے۔ اسلام نے انسان کے باطن کی اصلاح کو ظاہری اعمال سے زیادہ اہمیت دی ہے کیونکہ اعمال کی اصل بنیاد نیت اور دل کی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر دل درست ہو تو اعمال بھی درست ہو جاتے ہیں اور اگر دل فاسد ہو تو نیک اعمال بھی اپنی حقیقی روح سے محروم ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے یاد رکھو وہ دل ہے۔ (اسلامی اخلاق و آداب) یہ حدیثِ مبارکہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اصلاحِ نفس دراصل دل کی اصلاح کا نام ہے۔ جب دل میں خوفِ خدا، محبتِ الٰہی اور آخرت کی فکر پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کے اعمال خود بخود نیکی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔

فکرِ آخرت انسان کو سب سے پہلے غرور اور تکبر سے نجات دلاتی ہے۔ دنیا میں دولت، اقتدار، علم اور شہرت انسان کو خود پسندی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنے لگتا ہے اور اپنی حیثیت کو بھول جاتا ہے لیکن جو شخص قبر کی تنہائی، حشر کے میدان اور حساب و کتاب کے مرحلے کو یاد رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا کی تمام عظمتیں عارضی ہیں۔ کل جس شخص کے آگے لوگ سر جھکاتے تھے وہ بھی مٹی کے نیچے ہوگا اور جس کے پاس بے شمار دولت تھی وہ بھی خالی ہاتھ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوگا۔ یہی احساس انسان کو عاجزی، انکساری اور فروتنی کی دولت عطا کرتا ہے۔

فکرِ آخرت کا دوسرا عظیم اثر یہ ہے کہ یہ انسان کو گناہوں سے بچاتی ہے۔ بہت سے لوگ قانون کے خوف سے جرائم نہیں کرتے لیکن جب قانون کی گرفت کمزور ہو تو وہ برائی کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا یقین ہو وہ تنہائی میں بھی گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ دنیا کی نظروں سے کوئی عمل پوشیدہ رہ سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم سے کچھ بھی مخفی نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ انسان جو بھی لفظ زبان سے نکالتا ہے اس پر نگہبان مقرر ہیں جو اسے محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ تصور مومن کے اندر ایک ایسی باطنی

نگرانی پیدا کرتا ہے جو کسی دنیاوی نگرانی سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب میں کردار کی تعمیر کا اصل ذریعہ قانون نہیں بلکہ ایمان اور آخرت کا یقین رہا ہے۔

اصلاحِ نفس کا ایک اہم پہلو خواہشاتِ نفس پر قابو پانا بھی ہے۔ انسان کے اندر بے شمار خواہشات موجود ہیں۔ اگر ان خواہشات کو لگام نہ دی جائے تو یہی انسان کو ظلم، خیانت، بد دیانتی، فحاشی اور دیگر اخلاقی برائیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسلام انسان کو خواہشات کا غلام بننے کے بجائے ان کا حاکم بننے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ یہ آیت انسانی شخصیت کی تعمیر کا ایک عظیم اصول بیان کرتی ہے۔ انسان کی اصل کامیابی اس میں نہیں کہ وہ ہر خواہش پوری کر لے بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا تابع بنا دے۔یہی وہ مقام ہے جہاں سے تقویٰ و پرہیز گاری اور روحانی ارتقاء کا سفر شروع ہوتا ہے۔

فکرِ آخرت انسان کو محاسبہ نفس کی عادت بھی سکھاتی ہے۔ محاسبہ نفس کا مطلب یہ ہے کہ انسان روزانہ اپنے اعمال کا جائزہ لے، اپنی غلطیوں کو پہچانے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اسلامی تاریخ کے عظیم کرداروں کی زندگیاں اس وصف سے بھرپور تھیں۔ حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنا حساب خود لے لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے اور اپنے آپ کو تول لو قبل اس کے کہ تمہیں تولا جائے۔(حکایتیں اور نصیحتیں:321) یہ مختصر جملہ درحقیقت اصلاحِ نفس کا مکمل نصاب ہے۔ آج انسان دوسروں کی غلطیوں پر نظر رکھنے میں تو بہت ماہر ہے لیکن اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لینے سے گریز کرتا ہے۔ نتیجتاً معاشرہ تنقید، نفرت اور الزام تراشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرے تو معاشرہ خود بخود اصلاح کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ فکرِ آخرت انسان کے اندر صبر و استقامت بھی پیدا کرتی ہے۔ دنیا کی زندگی آزمائشوں سے بھرپور ہے۔ کبھی غربت، کبھی بیماری، کبھی ناکامی اور کبھی عزیزوں کی جدائی انسان کو پریشان کر دیتی ہے۔ ایسے مواقع پر اگر آخرت کا تصور موجود نہ ہو تو انسان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے لیکن مومن جانتا ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف عارضی ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائے گا۔یہی یقین اسے مشکلات کے باوجود ثابت قدم رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے اس کے لیے ہر حال میں خیر ہی خیر ہے۔ اگر اسے خوشی ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور اگر مصیبت آتی ہے تو صبر کرتا ہے۔(اسلامی اخلاق و آداب) یہ حدیث فکرِ آخرت کے اسی عظیم اثر کو بیان کرتی ہے کہ مومن دنیا

کے حالات سے ٹوٹتا نہیں بلکہ انہیں اپنے لیے اجر کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ اصلاحِ نفس کا ایک اہم شعبہ اخلاقِ حسنہ بھی ہے۔ سچائی، دیانت داری، امانت، عدل، رحم، عفو اور درگزر وہ اوصاف ہیں جو ایک پاکیزہ نفس کی علامت ہیں۔ آخرت کی فکر انسان کو ان صفات کا حامل بناتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل قدر و قیمت اعمال اور اخلاق کی ہے نہ کہ مال و دولت اور ظاہری شان و شوکت کی۔ آج انسان ترقی کے باوجود شدید روحانی بحران کا شکار ہے۔ مادیت پرستی نے اسے آسائشیں تو دی ہیں لیکن سکون نہیں دیا۔ دولت میں اضافہ ہوا ہے لیکن اطمینانِ قلب کم ہو گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی وسعت نے معلومات تو بڑھا دی ہیں لیکن حکمت و بصیرت کو کمزور کر دیا ہے۔ ایسے دور میں فکرِ آخرت اور اصلاحِ نفس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جب تک انسان اپنے باطن کو سنوارنے کی کوشش نہیں کرے گا بیرونی ترقی اسے حقیقی خوشی نہیں دے سکتی۔ اولیائے کرام اور صالحین کی زندگیاں اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہیں۔ انہوں نے دنیاوی جاہ و منصب کو اپنی منزل نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کو اپنا مقصد بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں جبکہ دنیاوی طاقت اور دولت کے بے شمار نشانات تاریخ کے صفحات میں گم ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فکرِ آخرت اور اصلاحِ نفس ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ آخرت کی فکر کے بغیر اصلاحِ نفس ممکن نہیں اور اصلاحِ نفس کے بغیر آخرت کی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب انسان اپنے انجام کو یاد رکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کی اصلاح کرتا ہے اور جب نفس کی اصلاح کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے قرب اور رضامندی کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں آخرت کی یاد کو زندہ کریں، اپنے اعمال کا محاسبہ کریں، اپنے اخلاق کو سنواریں، اپنی خواہشات کو شریعت کے تابع بنائیں اور اپنے نفس کی مسلسل اصلاح کی کوشش کریں۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو دنیا میں عزت، سکون اور وقار عطا کرتا ہے اور آخرت میں دائمی کامیابی اور نجات کا سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکرِ آخرت کی دولت، اصلاحِ نفس کی توفیق اور اپنی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی سعادت عطا فرمائے۔



جہیز: ایک معاشرتی ناسور اور ہمارا کردار

محمد فداء المصطفیٰ قادری

متفرقات

انسانی معاشرہ مختلف رسوم وروایات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بعض رسمیں ایسی ہوتی ہیں جو معاشرے کی تعمیر، خوش حالی اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہیں، جبکہ بعض رسمیں ایسی بھی جنم لیتی ہیں جو رفتہ رفتہ پورے سماج کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ برصغیر کے مسلم معاشرے میں جہیز کی رسم انہی مہلک معاشرتی بیماریوں میں سے ایک ہے جس نے بے شمار خاندانوں کی خوشیوں کو نگل لیا، والدین کی کمروں کو قرضوں کے بوجھ سے جھکا دیا اور شادی جیسے مقدس اسلامی رشتے کو ایک تجارتی معاملے میں تبدیل کر دیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جس رسم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، وہ آج بعض مسلمانوں کے نزدیک معاشرتی وقار اور عزت کا معیار بن چکی ہے۔

جہیز دراصل اس سامان کو کہا جاتا ہے جو لڑکی کے والدین شادی کے موقع پر اپنی بیٹی کو دیتے ہیں، لیکن موجودہ دور میں اس کا مفہوم یکسر بدل چکا ہے۔ اب یہ محبت اور تعاون کی علامت نہیں بلکہ ایک ایسی معاشرتی مجبوری بن چکی ہے جس کے بغیر اکثر رشتے طے نہیں ہوتے۔ کہیں نقد رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، کہیں گاڑی کی فرمائش ہوتی ہے، کہیں قیمتی فرنیچر اور برقی آلات کی فہرست تھما دی جاتی ہے۔ بظاہر اسے تحفہ کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا دباؤ ہے جس کے نیچے غریب اور متوسط طبقہ بری طرح پس جاتا ہے۔

اسلام نے نکاح کو آسان بنانے کی تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ" ترجمہ: "اور تم اپنے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا۔"

(القرآن، سورۃ النور: 32، ترجمہ کنز الایمان، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

اس آیت میں نکاح کو آسان بنانے کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن آج ہم نے نکاح کو اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ ہزاروں لڑکیاں صرف جہیز کی وجہ سے شادی کی عمر گزر جانے کے باوجود اپنے گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ صورتحال نہ صرف معاشرتی بگاڑ کو جنم دیتی ہے بلکہ بہت سی اخلاقی اور نفسیاتی خرابیوں کا سبب بھی بنتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مُؤْنَةً"۔ ترجمہ: "سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو۔" (مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 145، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت)

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ برکت کا تعلق نمود و نمائش اور فضول اخراجات سے نہیں بلکہ سادگی اور اخلاص سے ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں برکت کی جگہ دکھاوا، تفاخر اور مقابلہ بازی نے لے لی ہے۔

جہیز کی رسم کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ معاشرتی نمود و نمائش ہے۔ بعض لوگ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں تاکہ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے سامنے اپنی شان و شوکت کا اظہار کر سکیں۔ ایک خاندان جب اس طرح کا غیر ضروری خرچ کرتا ہے تو دوسرے خاندان بھی اسی کی تقلید کرتے ہیں۔ یوں ایک غلط روایت پورے معاشرے میں جڑ پکڑ لیتی ہے۔ اردو کی کہاوت ہے: "دیکھا دیکھی سادھے جوگ، چھوٹے جان سے بڑا روگ۔" حقیقت بھی یہی ہے کہ تقلیدِ باطل نے اس ناسور کو مزید مضبوط کر دیا ہے۔

ہندوستانی مسلم معاشرے میں جہیز کے نتیجے میں بے شمار معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ غریب والدین اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے سودی قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کئی خاندان اپنی زمینیں اور زیورات فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض گھروں میں برسوں کی جمع پونجی صرف ایک دن کی نمائش کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر مطالبات پورے نہ ہوں تو لڑکی کو طعنوں، ذلتوں اور بعض اوقات جسمانی و ذہنی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض نوجوان، جو خود کو تعلیم یافتہ اور مہذب سمجھتے ہیں، جہیز کے مطالبات کو اپنا حق تصور کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں مرد کو لینے والا نہیں بلکہ دینے والا بنایا گیا ہے۔ شریعت نے عورت پر مہر فرض نہیں کیا بلکہ مرد پر مہر لازم کیا ہے۔ اگر اسلام کا مزاج سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام معاشی بوجھ لڑکی کے خاندان پر نہیں بلکہ مرد پر ڈالتا ہے تاکہ عورت عزت اور وقار کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی متعدد مقامات پر فضول رسموں اور غیر شرعی معاشرتی بوجھوں کی مذمت فرمائی ہے اور مسلمانوں کو سنت کے مطابق سادہ نکاح اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ اہلِ علم ہمیشہ سے اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ شادی کو آسان بنایا جائے اور ایسی رسوم کا خاتمہ کیا جائے جو شریعت اور عقل دونوں کے خلاف ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بیماری کا علاج کیا ہے؟ سب سے پہلی ذمہ داری نوجوانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر نوجوان خود یہ اعلان کر دیں کہ وہ جہیز نہیں لیں گے تو اس مسئلے کا ایک بڑا حصہ خود بخود حل ہو سکتا ہے۔ معاشرے کی تبدیلی ہمیشہ نوجوان نسل سے شروع ہوتی ہے۔ جو نوجوان اپنی تعلیم، دیانت اور کردار پر فخر کرتا ہے، اسے چند سامانِ دنیا کے لیے اپنی عزتِ نفس کا سودا نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری ذمہ داری والدین کی ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ جہیز کو حق نہیں بلکہ ایک معاشرتی برائی سمجھیں۔ اسی طرح بیٹیوں کے والدین کو بھی غیر ضروری مقابلہ بازی سے بچنا چاہیے۔ اگر اپنی خوشی سے کوئی ضروری سامان بیٹی کو دینا چاہیں تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے، لیکن اسے معاشرتی فریضہ یا عزت کا معیار نہیں بنانا چاہیے۔

تیسری ذمہ داری علماء، ائمہ اور دینی اداروں کی ہے۔ مساجد کے خطبات، دینی اجتماعات اور اصلاحی پروگراموں میں اس مسئلے کو مستقل موضوع بنایا جانا چاہیے۔ جب تک عوامی شعور بیدار نہیں ہو گا، اس رسم کا خاتمہ مشکل رہے گا۔ علماء کرام کو چاہیے کہ نکاح کے موقع پر جہیز کے خلاف واضح پیغام دیں اور سنت کے مطابق سادہ شادیوں کی حوصلہ افزائی کریں۔

چوتھی ذمہ داری سماجی تنظیموں اور تعلیمی اداروں کی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں نوجوانوں کو یہ شعور دیا جائے کہ انسان کی عزت اس کے کردار، علم اور تقویٰ میں ہے، نہ کہ جہیز کے سامان میں۔ ایسے نوجوانوں اور خاندانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے جو بغیر جہیز کے نکاح کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جہیز صرف ایک رسم نہیں بلکہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ جب تک ذہن تبدیل نہیں ہوں گے، قوانین اور نعروں سے مکمل کامیابی حاصل نہیں ہو گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے گھروں سے اس اصلاح کا آغاز کریں۔ اگر ہر مسلمان یہ عہد کر لے کہ نہ جہیز لے گا، نہ اس کا مطالبہ کرے گا اور نہ اس رسم کی حوصلہ افزائی کرے گا، تو آنے والی نسلیں اس لعنت سے محفوظ ہو سکتی ہیں۔

آج وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اسلام کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کریں، نکاح کو آسان بنائیں، سادگی کو اپنائیں اور جہیز جیسی ظالمانہ رسم کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں۔ یہی دینی غیرت کا تقاضا ہے، یہی معاشرتی اصلاح کا راستہ ہے اور یہی وہ عمل ہے جس کے ذریعے ہم اپنی بیٹیوں کے مستقبل کو محفوظ اور اپنے معاشرے کو ایک بڑے ناسور سے نجات دلا سکتے ہیں۔ بقول شاعر:

رسم و رواجِ باطل کو مٹانا ہو گا
ہر گھر کو سنتوں سے سجانا ہو گا

اگر ہم نے آج اس مسئلے کے حل کی سنجیدہ کوشش نہ کی تو آنے والی نسلیں بھی اسی بوجھ تلے کراہتی رہیں گی، لیکن اگر ہم نے ہمت، بصیرت اور اخلاص کے ساتھ قدم اٹھایا تو یقیناً ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جہاں شادی خوشی، محبت اور رحمت کا پیغام ہو گی، تجارت اور مطالبات کا میدان نہیں۔



اچھے اور صاف ستھرے بنو!

از: عمران رضا عطاری مدنیالمدینۃ العلمیہ، دعوت اسلامی ھند

متفرقات

دینِ اسلام کی روشن تعلیمات میں صفائی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ بچہ ہو یا بوڑھا، جوان ہو یا عمر رسیدہ، ہر شخص اپنی ظاہری اور باطنی صفائی کا اہتمام کرے۔ مسلمان کا لباس پاک و صاف ہو، بال سلیقے سے سنوارے ہوئے ہوں، ناخن تراشے ہوئے ہوں، مونچھیں درست ہوں اور اس کی شخصیت ستھرے پن اور نفاست کا نمونہ نظر آئے۔

اسلام صرف جسم اور لباس کی صفائی ہی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ روزمرہ استعمال کی اشیاء، گھر، دکان، دفتر اور ارد گرد کے ماحول کو بھی صاف ستھرا رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ پاکیزگی اور صفائی نہ صرف صحت و تندرستی کا ذریعہ ہے بلکہ یہ اسلامی تہذیب و تمدن کا نمایاں شعار اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا بھی ایک اہم سبب ہے۔

لیکن افسوس! ہمارے معاشرے میں بعض لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جنہیں صفائی، ستھرائی، طہارت اور نفاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے کپڑے میلے ہوتے ہیں، منہ سے ناگوار بو آرہی ہوتی ہے، ناخن بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، جسم گندگی کا شکار ہوتا ہے اور استعمال کی اشیاء بھی بے ترتیبی اور بدنظمی کا منظر پیش کررہی ہوتی ہیں۔ الغرض ان کی شخصیت اور رہن سہن کا انداز نفاست اور سلیقے کے خلاف نظر آتا ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ ایسے افراد سے میل جول رکھنے سے کتراتے ہیں، ان کے قریب بیٹھنا پسند نہیں کرتے اور حتیٰ کہ ان سے تعلقات قائم رکھنے میں بھی دشواری محسوس کرتے ہیں۔ یوں وہ خود اپنی غفلت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں ناپسندیدہ بن جاتے ہیں۔ ایسوں کے لیے چند احادیث پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں تاکہ یہ احادیث پڑھ کر انھیں احساس ہو کہ دینِ اسلام کس قدر نفاست پسند مذہب ہے اور اپنے ماننے والوں کو طہارت کی تعلیم دیتا ہے۔

إنّ اللہ تَعَالَى يُحِبُّ النّاسِكَ النّظِيفَ. بے شک اللہ تعالیٰ پاکیزہ اور صاف ستھرا رہنے والے عبادت گزار کو پسند فرماتا ہے۔ (جامع الاحادیث، ۸/ ۲۴۲، حدیث: ۷۲۲۰)

الْإِسْلَامُ نَظِيفٌ فَتَنَظَّفُوا، فَإِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا نَظِيفٌ. اسلام پاکیزگی والا دین ہے، لہٰذا تم بھی پاک وصاف رہو، کیوں کہ جنت میں پاکیزہ لوگ ہی داخل ہوں گے۔ (المعجم الاوسط، ۵/۱۳۹، حدیث: ۴۸۹۳)

تَنَظَّفُوا بِكُلِّ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَإِنَّ اللهَ بَنَى الإِسْلَامَ عَلَى النَّظَافَةِ وَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ إِلا كُلُّ نَظِيفٍ. جس قدر تم سے ہو سکے صفائی اختیار کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بنیاد پاکیزگی پر رکھی ہے، اور جنت میں صرف پاکیزہ لوگ ہی داخل ہوں گے۔ (التدوین فی اخبار قزوین، ۱/۱۷۶)

طَهِّرُوا هَذِهِ الْأَجْسَادَ طَهَّرَكُمُ اللهُ، فَإِنَّهُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَبِيتُ طَاهِرًا إِلَّا بَاتَ مَعَهُ فِي شِعَارِهِ مَلَكٌ، لَا يَنْقَلِبُ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ إِلَّا قَالَ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِكَ فَإِنَّهُ بَاتَ طَاهِرًا. اپنے جسموں کو پاک رکھا کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں پاکیزگی عطا فرمائے گا۔ بے شک جو بندہ پاکی کی حالت میں رات گزارتا ہے، اس کے ساتھ اس کے بستر میں ایک فرشتہ رات بھر رہتا ہے۔ جب بھی وہ رات میں کروٹ بدلتا ہے تو فرشتہ دعا کرتا ہے: "اے اللہ! اپنے اس بندے کی مغفرت فرما، کیونکہ یہ پاکی کی حالت میں سویا ہے۔" (المعجم الاوسط، ۵/۲۰۴، حدیث: ۵۰۸۷)

رزق میں برکت کا سبب:

ہمیں چاہیے کہ اپنے گھر کے برتنوں کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھیں اور جب بھی وہ گندے ہو جائیں تو انہیں فوراً دھو کر پاک صاف کر لیں۔ اسی طرح گھر کے صحن، آنگن اور ارد گرد کے ماحول کی صفائی کا بھی خصوصی اہتمام کریں۔ پاکیزگی نہ صرف صحت و تندرستی کا ذریعہ ہے بلکہ احادیثِ مبارکہ کے مطابق یہ رزق میں برکت، گھر میں خوشحالی اور رحمتِ الٰہی کے حصول کا بھی سبب ہے۔ لہٰذا صفائی اور نفاست کو اپنی زندگی کا معمول بنائیے اور اپنے گھر کو پاکیزگی و سلیقے کا نمونہ بنائیے۔ حدیث دیکھیں!

غسل الإناء وطهارة الفناء يورثان الغناء. برتنوں کو دھونا اور گھر کے صحن (یا ماحول) کو صاف رکھنا خوشحالی اور فراخیِ رزق کا سبب بنتا ہے۔ (تاریخِ بغداد، ۱۲/۹۱)

کپڑوں کا صاف رکھنے کا حکم:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: يا عائشة اغسلي هذين البردين. اے عائشہ! ان دونوں چادروں کو دھو دو۔ میں نے عرض کی: یارسولَ اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں نے تو کل ہی انہیں دھویا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أما علمت أن الثوب يسبّح، فإذا اتسخ انقطع تسبيحه. کیا تم نہیں جانتیں کہ کپڑا بھی تسبیح کرتا ہے، اور جب وہ میلا ہو جاتا ہے تو اس کی تسبیح منقطع ہو جاتی ہے۔"

(تاریخِ بغداد، ۹/۲۴۵)

محترم قارئینِ کرام! ہمیں چاہیے کہ ہم صفائی اور پاکیزگی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں، اپنے جسم، لباس، گھر اور ماحول کو صاف ستھرا رکھیں اور طہارت و نفاست کے پیکر بن کر زندگی گزاریں۔ یقیناً پاکیزگی نہ صرف صحت و تندرستی کا ذریعہ ہے بلکہ یہ اسلامی تعلیمات کا حسین مظہر اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔

چند چیزوں کا خاص خیال رکھیں!

۱: اپنے جسم کی صفائی کا اہتمام کیجیے: روزانہ یا حسبِ ضرورت غسل کیجیے، نہاتے وقت اچھا صابن اور شیمپو استعمال کیجیے اور بدن کی صفائی کا خاص خیال رکھیے۔ نیز خوشبو لگانے کی عادت اپنایئے تاکہ آپ کی شخصیت پاکیزگی اور نفاست کا نمونہ بن جائے۔

۲: جسم کے زائد بال وقت پر صاف کیجیے: مونچھوں کو پست رکھیے، ناخن بڑھنے سے پہلے ہی تراش لیجیے اور سنت کے مطابق اپنی ظاہری صفائی کا اہتمام کیجیے۔

۳: صاف ستھرے لباس پہننے کی عادت بنایئے: کپڑے دھلے ہوئے، خوشبودار اور مناسب طور پر استری شدہ ہوں۔ جب کپڑے میلے ہو جائیں تو انہیں تبدیل کر لیجیے اور ہمیشہ پاکیزہ لباس زیبِ تن رکھیے۔

۴: اپنی رہائش، تعلیم اور کام کی جگہ کو صاف ستھرا رکھیے: گھر، کمرہ، دفتر یا درس گاہ میں باقاعدگی سے صفائی کیجیے، جھاڑو لگایئے اور وقتاً فوقتاً دھلائی کا اہتمام کیجیے۔ اگر ممکن ہو تو خوشبو کا استعمال بھی کیجیے تاکہ ماحول خوشگوار رہے اور ناگوار بو پیدا نہ ہو۔

۵: روزمرہ استعمال کی اشیاء کی صفائی کا بھی خیال رکھیے: پانی کی بوتل، کپ، گھڑی، چشمہ، موبائل فون، لیپ ٹاپ، تکیہ، بستر اور دیگر استعمال کی چیزوں کو باقاعدگی سے صاف رکھیے، کیوں کہ نفاست پسند مسلمان اپنی ہر چیز میں صفائی کا اہتمام کرتا ہے۔



امام احمد رضا کے قصیدۂ معراج میں جلوۂ عرفان

قسط دوم

از: مولانا ازہر القادری، جامعہ مٹھنا، سدھارتھ نگر

متفرقات

بہار ہے شادیاں مبارک چمن کو آبادیاں مبارک
ملک فلک اپنی اپنی لے میں یہ گھر عنادل کا بولتے تھے

یہ وہ شعر ہے جس میں آسمان کی وسعتیں بھی جھک کر سلام کرتی دکھائی دیتی ہیں اور زمین کے چمن بھی اپنی رعنائیوں کو نذر قدم مصطفی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مصرعۂ نور ہے جس میں معراج کی ساعتیں اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ گنگناتی ہیں اور کائنات اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ خوشی کے نغمے بکھیرتی ہے۔ اس شعر میں بہار محض موسم نہیں، ایک روحانی کیفیت ہے؛ شادیاں محض رسومات نہیں، ایک کائناتی جشن ہیں؛ چمن محض باغ نہیں، ایک جہان امکان ہے؛ اور آبادیاں محض بستیاں نہیں، نور کے قافلے ہیں۔ حسان الہند امام احمد رضا نے اس ایک لمحے کو: جس میں سرور عالم عرش کے سفر پر روانہ ہوئے، ایسے لفظی پیرہن میں ڈھالا ہے کہ معنی کی ندیاں اس میں بہتی ہیں، مفہوم کی لہریں اس میں رقصاں ہیں اور رمز و اشارات کی خوشبوئیں اس سے اٹھتی ہیں۔

یہ بہار وہ ہے جس میں ہر کلی کے لبوں پر تبسم ہے، ہر غنچے کے دل میں ترنم اور ہر شاخ کے دامن میں نغمگی۔ شادیاں وہ ہیں جن میں زمان و مکان اپنے اپنے پیمانے بھول جاتے ہیں اور ساعتیں خوشی کی تسبیح بن کر گردش کرنے لگتی ہیں۔ چمن وہ ہے جو ازل کے خوابوں سے بیدار ہو کر ابد کی آنکھوں میں جاگنے لگتا ہے، اور آبادیاں وہ ہیں جن کے در و دیوار پر نور کے نقوش ثبت ہو جاتے ہیں۔ یہاں فصاحت اپنی آبرو کے ساتھ جلوہ گر ہے، بلاغت اپنی شان کے ساتھ ہمکلام، سلاست اپنی روانی کے ساتھ ہم سفر اور شگفتگی اپنی لطافت کے ساتھ ہم نوا۔ ہر لفظ میں نزاکت معنی ہے، ہر ترکیب میں حسن ادا، ہر ترتیب میں وقار بیان، اور ہر آہنگ میں تمکنت سخن۔ یہ شعر محض بیان نہیں، بیان جمال ہے؛ محض معنی نہیں، معنی آفرینی ہے؛ محض تصویر نہیں، پیکر تراشی ہے؛ محض نغمہ نہیں، نغمگی کائنات ہے۔

"بہار ہے شادیاں مبارک" میں صنعت مراعات النظیر کی وہ نزاکت جھلکتی ہے جو بہار اور شادی کے ربط کو ایک ہی سانس میں سمو دیتی ہے۔ بہار کی آمد اور شادی کی مسرت؛ دونوں میں تازگی، دونوں میں شادمانی، دونوں میں رنگینی۔ یہاں شاعر نے ایک لطیف توازن کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔ صنعت حسن تعلیل کی لطافت بھی جلوہ گر ہے کہ گویا بہار اس لیے آئی ہے کہ شادیاں مبارک ہوں، اور شادیاں اس لیے ہوئیں کہ بہار اپنی بہاریت ثابت کرے۔ صنعت تضاد کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دکھائی دیتی ہے؛ کہ جہاں سرد موسم کی اداسی رخصت ہوتی ہے اور شادمانی کی دھوپ اترتی ہے۔ یہ تضاد محض موسمی نہیں، کیفیاتی ہے؛ ایک طرف انتظار کی سردی، دوسری طرف وصال کی گرمی۔

" چمن کو آبادیاں مبارک" میں صنعت لف و نشر کی دلکشی ہے: بہار اور شادیاں پہلے، چمن اور آبادیاں بعد میں؛ گویا پہلے سبب، پھر نتیجہ؛ پہلے کیفیت، پھر مظہر۔ یہاں چمن ایک علامت ہے اس کائنات کی جو نور محمدی کے قدموں سے معطر ہوئی اور آبادیاں اس زندگی کی جو اس نور کے فیضان سے روشن ہوئی۔ کنایہ بھی ہے کہ چمن محض باغ نہیں، اہل دل کی بستیاں ہیں؛ اور آبادیاں محض شہر نہیں، ایمان کی کہکشائیں ہیں۔ استعارہ یہ کہ ہر دل ایک کلی ہے اور ہر روح ایک شاخ، جن پر خوشی کے پرندے آکر بولتے ہیں۔ تشبیہ یہ کہ یہ عالم اس گھڑی ایک دلہن کی طرح آراستہ ہے، جس کے ماتھے پر بہار کا جھومر ہے اور جس کے ہونٹوں پر مسرت کی مسکراہٹ۔

"ملک فلک اپنی اپنی لے میں" میں کائنات کی موسیقیت بولتی ہے۔ یہاں ملک فلک محض فرشتوں کی جماعت نہیں، ایک ہم آہنگ ارکسٹر ہے جس کے ہر ساز کی اپنی لے ہے، مگر سب کی لے ایک مرکز پر جمع ہے۔ صنعت ترصیع کی ہم آہنگی، صنعت سجع کی شیرینی، صنعت تکرار کی دلنشینی، سب یہاں اپنے اپنے حسن کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔ لے محض آہنگ نہیں، تقدیر کی تال ہے؛ وزن محض بحر نہیں، ابد کی پیمائش ہے؛ قافیہ محض صوت نہیں، معنی کی گونج ہے؛ ردیف محض لفظ نہیں، وجد کی بازگشت ہے۔ یہ وہ ساعت ہے جب فلک کی پیشانی پر بھی مسرت کی شکن پڑتی ہے اور ستاروں کے لبوں پر بھی ترنم آتا ہے۔

"یہ گھر عنادل کا بولتے تھے" میں تشخیص کی وہ لطافت ہے جس سے مکان بھی جیتا جاگتا ہو جاتا ہے اور دیواریں بھی نغمہ سرا بن جاتی ہیں۔ عنادل محض بلبلیں نہیں، عاشقوں کی زبانیں ہیں؛ گھر محض چار دیواری نہیں، محبت کی آغوش ہے۔ صنعت حسن مطلع کی طرح یہ مصرعہ بھی ایک دروازہ ہے جس سے داخل ہوں تو منظر نگاری کے باغ کھلتے چلے جاتے ہیں۔ پیکر تراشی ایسی کہ آنکھوں کے سامنے بہار کا فرش بچھتا ہے، ہوا میں خوشبو تیرتی ہے، روشنی کے پرندے اڑتے ہیں، اور آوازوں کے پھول کھلتے ہیں۔ تجسیم کی یہ شان کہ خوشی ایک جسم بن کر رقصاں نظر آتی ہے اور مسرت ایک صورت بن کر مسکراتی دکھائی دیتی ہے۔

یہ شعر رمزیت اسلوب کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس میں اشارہ بھی ہے اور تصریح بھی، اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی، ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی۔ مگر سب ایک توازن کے ساتھ۔ یہاں معنی تہہ دار ہیں: پہلی تہہ میں موسم بہار اور شادی کی خوشی،

دوسری تہہ میں معراج کی مسرت، تیسری تہہ میں کائنات کی ہم نوائی اور چوتھی تہہ میں عشق کی سرشاری۔ یہ تہ داری ہی اس شعر کو گیرائی بخشتی ہے اور ژرف نگاہی عطا کرتی ہے۔ باریک بینی کا یہ عالم کہ ہر لفظ اپنی جگہ ایک جہان رکھتا ہے، ہر ترکیب اپنی ترتیب میں ایک داستان سناتی ہے اور ہر نکتہ اپنے دامن میں ایک راز سمیٹے ہوئے ہے۔

فکری سطح پر یہ شعر کائناتی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں انسان مرکز نہیں، محبوب کائنات مرکز ہیں؛ اور کائنات اُن کے گرد طواف کرتی دکھائی دیتی ہے۔ فلسفیانہ طور پر یہ وہ لمحہ ہے جب علت و معلول کے رشتے اپنی نئی تعبیر پاتے ہیں: بہار علت نہیں، معلول ہے؛ شادیاں سبب نہیں، اثر ہیں؛ اصل سبب وہ نور ہے جو معراج کی ساعت میں جلوہ گر ہوا۔ منطق یہاں عشق کے تابع ہے اور حکمت یہاں وجدان کے قدموں میں بیٹھی ہے۔ دانائی اس بات میں ہے کہ عقل اپنی حد پہچانے اور بصیرت کے در پر دستک دے۔ ادراک یہ کہ کائنات کی ہر شے اس ایک لمحے کے گرد گردش کر رہی ہے۔ شعور یہ کہ وقت نے اپنی رفتار تھام لی ہے اور مکان نے اپنی وسعت سمیٹ لی ہے۔

جمالیاتی سطح پر یہ شعر حسنِ انتخاب کی درخشاں مثال ہے۔ بہار، شادیاں، چمن، آبادیاں، ملک فلک، لے، گھر، عنادل: یہ سب ایسے الفاظ ہیں جو صوتی حسن کے ساتھ معنوی جمال بھی رکھتے ہیں۔ آہنگ بیان میں ایک نرمی ہے جو دل کو چھوتی ہے اور ایک گرمی ہے جو روح کو گرماتی ہے۔ بانکپن یہ کہ بات سیدھی ہے مگر اثر گہرا؛ شائستگی یہ کہ لہجہ وقار سے آراستہ؛ تہذیب زبان یہ کہ ہر لفظ اپنے دائرے میں معطر؛ متانت یہ کہ بیان میں ٹھہراؤ؛ اور تمکنت یہ کہ خیال میں وقار۔ روانیٔ خیال ایسی کہ قاری بہاؤ کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں ٹھوکر نہیں کھاتا۔

تنقیدی نظر سے دیکھیں تو یہ شعر حسنِ ترکیب اور حسنِ ترتیب کا نمونہ ہے۔ یہاں صنعتِ توشیح کی دلکشی ہے کہ لفظی زیور معنی کے گلے میں جھلملاتے ہیں۔ صنعتِ اقتباس کی شان یہ کہ آسمانی لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ صنعتِ تضمین کی لطافت یہ کہ کائنات کی نغمگی کو اپنے اندر سمو لیا گیا ہے۔ صنعتِ استطراد کی خوشبو یہ کہ ایک خیال سے دوسرے خیال تک سفر میں بھی تسلسل قائم ہے۔ یہ سب مل کر وحدتِ تاثر پیدا کرتے ہیں، وحدتِ خیال کو مضبوط کرتے ہیں اور وحدتِ موضوع کو روشن کرتے ہیں۔

تخیل یہاں پرواز کرتا ہے مگر زمین سے رشتہ نہیں توڑتا۔ تصور آسمانوں تک جاتا ہے مگر دل کی دہلیز پر لوٹ آتا ہے۔ وجدان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور احساس کی انگلیاں لرزتی ہیں۔ جذبات کی لہر اٹھتی ہے اور عاطفہ کی دھوپ چمکتی ہے۔ تاثر انگیزی کا یہ عالم کہ قاری کی سانس بھی نغمہ بن جاتی ہے اور دل کی دھڑکن بھی تال میں آجاتی ہے۔ تاثیر پذیری یہ کہ لفظ دل میں اتر کر چراغ بن جاتے ہیں اور جملے روح میں اتر کر دعا ہو جاتے ہیں۔

یہ شعر اپنے اندر فکر نو اور تعبیر جدید کی تازگی رکھتا ہے۔ معنی کی تازگی اس میں بہار کی طرح پھوٹتی ہے اور لفظ کی نزاکت شبنم کی طرح جھلملاتی ہے۔ انفرادیت یہ کہ منظر وہی ہے جو سب دیکھتے ہیں مگر نظر وہ ہے جو کم ہی رکھتے ہیں۔ ندرت یہ کہ خوشی کو کائنات کی زبان میں ڈھال دیا گیا ہے۔ جدت یہ کہ روحانی لمحے کو موسمی استعارے میں باندھ دیا گیا ہے۔ طراوت یہ کہ ہر قرأت پر نئی خوشبو آتی ہے اور ہر تکرار پر نیا رنگ کھلتا ہے۔

یہاں منظر نگاری اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ بہار کے پردے ہٹتے ہیں، شادی کے چراغ جلتے ہیں، چمن کے دروازے کھلتے ہیں، آبادیاں مسکراتی ہیں، فلک کے ساز بجتے ہیں اور عنادل کے نغمے گونجتے ہیں۔ تصویر کشی ایسی کہ آنکھیں دیکھتی ہیں، کان سنتے ہیں، ناک خوشبو سونگھتی ہے، ہاتھ لمس محسوس کرتے ہیں اور دل سرور پیتا ہے۔ تجرید یہ کہ خوشی ایک تصور بن کر ذہن میں ٹھہرتی ہے اور تجسید یہ کہ وہی خوشی ایک منظر بن کر سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ تخییل یہ کہ کائنات ایک باغ ہے اور محبوب اس باغ کی بہار۔

معنویت کی گہرائی میں جائیں تو یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ اصل آبادانی دل کی ہے اور اصل چمن روح کی۔ بہار تب آتی ہے جب ایمان کھلتا ہے، اور شادیاں تب مبارک ہوتی ہیں جب محبت سچی ہو۔ ملک فلک کی لے تب ہم نوا ہوتی ہے جب انسان اپنی لے محبوب کی لے سے ملالے۔ عنادل تب بولتے ہیں جب خاموش دلوں میں ذکر کی بہار آتی ہے۔ یہ اشارات ہیں، یہ لطائف ہیں، یہ اسرار ہیں اور یہ سب عقدہ کشائی کے دروازے کھولتے ہیں۔

یہاں فہم دقیق کی ضرورت ہے کہ لفظوں کے پیچھے چھپی روشنی کو دیکھا جائے اور معنی کے اندر دھڑکتے دل کو سنا جائے۔ نکتہ رسی یہ کہ بہار کی مسرت کو معراج کی عظمت کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ نکتہ سنجی یہ کہ شادی کی خوشی کو کائنات کی ہم نوائی بنا دیا گیا ہے۔ باریک بینی یہ کہ چمن کی آبادانی کو فلک کی لے میں رکھ دیا گیا ہے۔ دقت نظر یہ کہ عنادل کے بول کو گھر کی زبان بنا دیا گیا ہے۔ عمقِ فکر یہ کہ ایک لمحے میں ازل و ابد کو سمو دیا گیا ہے۔

آہنگ بیان میں موسیقیت ہے، اور موسیقیت میں معنویت۔ بحر کی موجیں خیال کو اٹھاتی ہیں، وزن کے بازو اسے سہارا دیتے ہیں، قافیہ اسے سمت دکھاتا ہے اور ردیف اسے منزل تک پہنچاتی ہے۔ صوتی حسن یہ کہ لفظوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں اور جملوں کے دیپ جلتے ہیں۔ موزونیت یہ کہ ہر مصرعہ اپنے قدموں میں تال باندھے چلتا ہے۔ لے یہ کہ دل خود بخود ہم نوا ہو جاتا ہے۔

یہ شعر ہمیں قدر شناسی سکھاتا ہے کہ لفظ کی قدر، معنی کی قدر، منظر کی قدر اور لمحے کی قدر۔ معیار شناسی یہ کہ فصاحت کیا ہے، بلاغت کیا ہے، اور حسن انتخاب کیا ہوتا ہے۔ فنی شعور یہ کہ صنعتیں محض زیور نہیں، معنی کے محافظ ہیں۔ جمالیاتی شعور یہ کہ حسن محض دکھائی نہیں دیتا، محسوس بھی ہوتا ہے۔ ادبی بصیرت یہ کہ ایک شعر میں پوری کائنات سمائی جاسکتی ہے۔

آخر کار یہ شعر ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں عقل خاموش ہو جاتی ہے اور دل بولنے لگتا ہے۔ جہاں منطق سر جھکا دیتی ہے اور عشق سر اٹھاتا ہے۔ جہاں فلسفہ سوال بن جاتا ہے اور محبت جواب۔ جہاں کائنات ایک گھر بن جاتی ہے اور گھر ایک نغمہ۔ جہاں عنادل کی آواز میں بہار کی خوشبو گھل جاتی ہے اور شادی کی روشنی فلک کی پیشانی پر چمکنے لگتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فصاحت بھی سجدہ ریز ہے، بلاغت بھی نیاز مند اور سلاست بھی دعا گو۔ یہی وہ ساعت ہے جس میں الفاظ عبادت بن جاتے ہیں اور معانی زیارت۔

یوں یہ شعر اپنے دامن میں معانی کی بارش، مطالب کی قوس قزح، مفاہیم کی کہکشاں اور مدعا کی روشنی رکھتا ہے۔ اس میں مقصد کی شفافیت ہے، مراد کی پاکیزگی ہے، منشا کی صداقت ہے اور مفہوم کی گہرائی ہے۔ یہ شعر ایک دریا ہے جس میں بہار کے کنول کھلتے ہیں، شادی کے چراغ جلتے ہیں، چمن کے راستے بنتے ہیں، آبادیاں مسکراتی ہیں، فلک کے ساز بجتے ہیں اور عنادل کے نغمے گونجتے ہیں۔ اور قاری اس دریا میں اتر کر سرور کی موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ دل کے ساحل پر پہنچ کر کہتا ہے واقعی: "بہار ہے شادیاں مبارک، چمن کو آبادیاں مبارک"۔



زوالِ امت اور ہماری غفلت

از: سلمیٰ شاھین امجدی

گوشۂ خواتین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم ایک ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں ظاہری ترقی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے، مگر باطن اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ ہماری نسلیں، جو کل کا مستقبل ہیں، آج ایسے طوفانوں میں گھری ہوئی ہیں جن کا ہمیں شاید صحیح اندازہ بھی نہیں۔ موبائل، سوشل میڈیا اور ایک ایسا تعلیمی نظام جو روح سے خالی ہے۔ یہ سب مل کر آہستہ آہستہ ہمارے بچوں کے دلوں سے ایمان کی روشنی چھین رہے ہیں، اور افسوس کہ ہم اس سب کو معمول سمجھ کر خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

یہ کوئی معمولی خطرہ نہیں، بلکہ ایک خاموش زوال ہے۔ جب بچہ اپنے رب کو پہچانے بے غیر دنیا کی چکاچوند میں قدم رکھتا ہے تو وہ علم حاصل تو کر لیتا ہے، مگر مقصدِ حیات کھو دیتا ہے۔ اسی درد کو محسوس کرتے ہوئے میں ایک جملہ کہتی ہوں اور یہ ایک میری درد بھری پکار ہے۔ "ابھی سنبھلو، ورنہ پچھتاؤ گے" یہ محض ایک جملہ نہیں بلکہ ایک بیداری کی صدا ہے، ایک ایسی تنبیہ جو دلوں کو جھنجھوڑ دینے کے لیے کافی ہے۔

اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا حل بھی ہمیں بتایا گیا ہے، اور وہ حل نہایت سادہ مگر مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ سب سے پہلے ہر مسجد میں مکتب کا قیام تاکہ بچوں کی پہلی پہچان دنیا نہیں بلکہ اللہ ہو۔ جب دل میں ابتدا ہی سے ایمان کی جڑیں مضبوط ہوں گی تو زمانے کے طوفان بھی اسے ہلا نہیں سکیں گے۔ اسی طرح ایسے اسلامی اسکولوں کی ضرورت ہے جہاں جدید تعلیم کے ساتھ ایمان کی حفاظت بھی ہو، جس سے صرف ڈگری نہیں بلکہ کردار ہی اصل کامیابی کی بنیاد ہے۔

آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ ہماری بچیاں، جو کل کی مائیں ہیں، دین سے جڑی رہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کے ماحول میں وہ کئی فکری آزمائشوں سے گزرتی ہیں، ایسے میں ان کے لیے رہنمائی اور کونسلنگ سینٹرز کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے، تاکہ وہ علم کے ساتھ ایمان کی حفاظت بھی کر سکیں۔

مساجد کو بھی صرف عبادت گاہ تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ انہیں علم و ہدایت کا مرکز بنایا جائے، جہاں درسِ قرآن کے ذریعے لوگوں کو موجودہ فتنوں کا جواب دیا جائے۔ قرآن وہ نور ہے جو ہر دور کے اندھیروں کو چیر سکتا ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس نور کو اپنی زندگیوں میں جگہ دیں۔

معاشرتی سطح پر بھی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہمارے محلے میں کوئی غریب صرف مجبوری کی وجہ سے اپنے ایمان پر سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ ہم سب کی ناکامی ہے۔ اس لیے بیت المال جیسے نظام کو زندہ کرنا ہوگا تاکہ کوئی بھی شخص صرف دنیاوی تنگی کی وجہ سے دین سے دور نہ ہو۔ اسی کے ساتھ انسانیت کی خدمت کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنانا ہوگا، کیوں کہ اسلام صرف باتوں سے نہیں بلکہ کردار سے پھیلتا ہے۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک چیز ہے۔ اور وہ ہے بیداری۔ غفلت کا پردہ چاک کرنا ہوگا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ منظر یاد کیجیے جب وہ آخری وقت میں بھی اپنی اولاد کے ایمان کی فکر کر رہے تھے۔ یہ ایک پیغام ہے۔ کہ ایک سچے مؤمن کی سب سے بڑی فکر اس کی نسل کا ایمان ہوتا ہے۔
آج ہمیں خود سے سوال کرنا ہوگا۔ کیا ہم بھی اپنی اولاد کے ایمان کے لیے اتنے ہی فکرمند ہیں؟ یا ہم نے دنیا کی دوڑ میں اس سب کو پسِ پشت ڈال دیا ہے؟
اب وقت آ گیا ہے کہ ہم انتظار چھوڑ دیں۔ تبدیلی کسی اور سے نہیں، ہم سے شروع ہوگی۔ اپنے گھر سے، اپنی اولاد سے، اپنی مسجد سے۔ اگر ہم نے آج قدم نہ اٹھایا تو کل پچھتاوا بھی ہمارے کسی کام نہ آئے گا۔

یاد رکھیں! وقت تیزی سے گزر رہا ہے، اور ہر گزرتا لمحہ ہمیں یا تو اپنے رب کے قریب کر رہا ہے، یا اس سے دور۔ فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو روشنی دیں یا اندھیروں کے حوالے کر دیں۔



پھنس گیا کنجوس

از: ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی

بچوں کی دنیا

پُرانے زمانے کی بات ہے ایک گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ بہت ہی کنجوس تھا۔ ایک بار وہ ایک جنگل سے گذر رہا تھا تو اس نے کھجور کا ایک درخت دیکھا، جس میں بہت سارے میٹھے میٹھے کھجور لگے ہوئے تھے۔ پھر کیا تھا؟... کنجوس آدمی کو مفت میں کھجور مل گئی، اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ اس نے جلدی جلدی درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔

وہ جب کافی اونچائی تک چڑھ گیا تو اچانک ایک شہد کی مکھی نے اسے ڈنک مار دیا۔ اس نے دیکھا کہ درخت پر شہد کی مکھیوں کا ایک بڑا سا چھتّا لگا ہوا ہے، وہ گھبر اُٹھا، اس نے نیچے چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچا،... لیکن یہ کیا؟ نیچے ایک کنواں تھا۔

وہ بہت زیادہ ڈر گیا اور وہ خدا سے دعا مانگنے لگا کہ :

”اے خدا! مجھے بچالے میں سو (۱۰۰) فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا۔“ پھر اس نے دھیرے دھیرے نیچے اترنے کی کوشش کی، تھوڑا نیچے آنے کے بعد اس نے کہا :

”سو (۱۰۰) نہیں تو پچھتر (۷۵) کو تو کھلا ہی دوں گا۔“ تھوڑا اور نیچے آنے پر اس نے کہا: ”چلو پچھتر (۷۵) نہیں تو پچاس (۵۰) کو تو ضرور کھلاؤں گا۔“

ایسا کرتے کرتے وہ نیچے آنے تک ایک (۱) فقیر تک پہونچ گیا۔ اور نیچے اتر کر وہ سلامتی کے ساتھ اپنے گھر چلا گیا۔ اس نے سارا حال اپنی بیوی کو کہہ سنایا۔

دوسرے روز بیوی نے ایک ایسے فقیر کو بلایا جس کا پیٹ خراب تھا اور جو کھانا ٹھیک ڈھنگ سے کھا نہیں سکتا تھا۔ فقیر بھی اتفاق سے کنجوس اور چالاک آدمی تھا، اس نے بیس (۲۰) روٹیاں، دہی، کھیر اور دوٗدھ پیک کرنے کو کہا اور جاتے وقت کنجوس آدمی کی بیوی سے کہا:

”اجی! میرا نذرانہ!“ اس نے سونے کی دو موتیاں فقیر کو دے دیں۔ شام کو جب کنجوس آدمی گھر واپس آیا تو اُس نے فقیر کے بارے میں پوچھا، تو اس کی بیوی نے اُسے سارا ماجرا کہہ سنایا، کنجوس آدمی کو بہت غصہ آیا، وہ لاٹھی لے کر فقیر کے گھر پہونچا۔ فقیر کی بیوی بہت چالاک تھی، اُس نے جب کنجوس آدمی کو غصے کی حالت میں اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ دروازے کے باہر آکر زور زور سے چلانے لگی کہ :

”پتا نہیں کس نے میرے شوہر کو کیا کھلا دیا ہے ؟ اُن کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے، ہائے! میں کیا کروں ؟ ایسا لگتا ہے اب وہ زندہ نہیں بچیں گے، ارے کوئی ہے جو میری خبر گیری کرے۔“

کنجوس آدمی یہ سُن کر بری طرح سہم گیا، اس نے فقیر کی بیوی سے کہا: ”آپ چلائیں مت، میں آپ کے شوہر کے علاج کے لیے ابھی گھر جا کر دو سونے کے سکّے بھیج دیتا ہوں۔“

چالاک فقیر گھر کے اندر بیٹھا مزے لے لے کر خوب ہنس رہا تھا۔ اس طرح ایک کنجوس نے ایک بڑے کنجوس کو پھنسا لیا۔



نظم وقت کامیاب زندگی کا راز

از: محمد احسان مصطفیٰ، متعلم جامعۃ المدینہ فیضانِ عطار، ناگ پور

جہان علم

طلبہ وطالبات کی علمی، ادبی اور فکری صلاحیتوں کو نکھارنے اور اجاگر کرنے کے لیے مخصوص کالم

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نہایت ہی قیمتی، حسین اور بے بدل نعمت وقت ہے، جسے اس نے ہر انسان کو یکساں عطا فرمایا ہے۔ کائنات کا نظام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ وقت کی پابندی کس قدر اہم ہے؛ سورج کا وقت پر طلوع و غروب ہونا، چاند کا مقررہ گردش میں رہنا، دن اور رات کا ایک خاص ترتیب کے ساتھ آنا جانا۔ یہ سب اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ پوری کائنات ایک مضبوط نظم وضبط اور وقت کی پابندی کے اصول پر قائم ہے۔

اسی منظر کو قرآنِ کریم نے نہایت عمدہ انداز میں بیان فرمایا:

"وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَاؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ" (سورۃ یٰسٓ:38)

اور سورج چلتا ہے اپنے ایک ٹھہراؤ کے لیے یہ حکم ہے زبردست علم والے کا۔

انسان، جو اشرف المخلوقات ہے، اگر اس فطری نظام سے سبق حاصل کرے اور اپنے اوقات کو منظم انداز میں گزارے تو یقیناً کامیابی اس کا مقدر بن جائے گی نیز وقت کی پابندی نہ صرف انسان کی شخصیت میں سنجیدگی، ذمہ داری اور وقار پیدا کرے گی بلکہ اسے عملی زندگی میں بھی نمایاں مقام عطا کرے گی جبکہ اس کے برعکس جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے اور اسے سستی، غفلت اور بے مقصد مشاغل میں ضائع کر دیتے ہیں، وہ بالآخر ناکامی اور شرمندگی کا شکار بن جاتے ہیں۔ اور جب وہ ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ بے سود کھو دیا ہے۔

یقیناً عقل مند اور کامیاب انسان وہی ہے؛ جو وقت کی پابندی کو اپنی عادت بنائے اور نظم وضبط کے ساتھ اس کا درست استعمال کرے۔ چناں چہ وقت کے قدر کے متعلق قران پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَ الْعَصْرِۙ(1) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍۙ(2) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ﳔ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۠(3)

ترجمہ: اس زمانہ محبوب کی قسم۔ بیشک آدمی ضرور نقصان میں ہے۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔

قارئینِ کرام !اب ہم اسی موضوع کی مزید وضاحت کے لیے چند احادیثِ مبارکہ اور اسلافِ امت کے بصیرت افروز اقوال و افعال پیش کرتے ہیں، جن سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اوقات کا ضیاع کس قدر نقصان دہ ہے اور وقت کا درست، بامقصد اور مؤثر استعمال انسان کی دینی و دنیاوی زندگی میں کس قدر عظیم برکتوں اور کامیابیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔

وقت اور تعلیمات نبوی ﷺ

نبیِ کریم ﷺ نے انسان کو جہاں عقائد، احکام، اذکار اور دیگر فرائض وواجبات کی جامع تعلیم دی ہے، وہیں وقت کو نہایت عمدہ، بامقصد اور مؤثر طریقے سے گزارنے کی بھی واضح اور حکیمانہ رہنمائی فرمائی۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: " پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، اور اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اور دولت مندی کو غربت سے پہلے، اور اپنی فراغت کو اپنی مشغولیت سے پہلے، اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے "۔(المستدرک علی الصحیحین، کتاب الرقاق، ج4، ص 341، ح7845، دار الکتب العلمیہ بیروت)

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عبرت نشان ہے: روزانہ صبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس وقت 'دن' یہ اعلان کرتا ہے: اگر آج کوئی اچھا کام کرنا ہے تو کرلو آج کے بعد میں کبھی پلٹ کر نہیں آوں گا"۔(شعب الایمان، ج3، ص386، ح3840)

مذکورہ ارشادِ نبوی ﷺ سے نہ صرف علم و عمل اور عبادت و ریاضت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، بلکہ وقت کی قدر و قیمت اور اس کے صحیح استعمال کی بھی مؤثر تعلیم ملتی ہے لہذا جو شخص اس حدیث کے پیشِ نظر اپنے شب و روز کو گزارے گا یقیناً وہ فلاح و کامیابی سے ہم کنار ہو گا۔

اقوالِ اسلاف اور وقت

تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر گواہ ہیں ک کہ ہمارے اسلافِ کرام نے وقت کی قدر و قیمت اور نظم و ضبط کو اپنی زندگی کا لازمی شعار بنا رکھا تھا۔ انہوں نے ہر لمحہ شعور، ترتیب اور استقامت کے ساتھ اس طرح گزارا کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ بے مقصد نہ رہا۔ ان کے نزدیک وقت ایک بیش قیمت امانت تھا؛ اس کا ضیاع صریح خسارہ اور اس کی حفاظت عین کامیابی تھی۔ یہی مثالی نظم و ضبط ان کی علمی رفعت اور عملی عظمت کا بنیادی راز بنا۔ ذیل میں اسلافِ امت کے چند اقوال و افعال پیش کیے جاتے ہیں؛ جو وقت کی قدر و قیمت، حسنِ استعمال اور منظم درخشاں مثالیں پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: إني لأمقت الرجل أن أراه فارغا. ليس في شيئ من عمل الدنيا و لا عمل الآخرة۔ یعنی بے شک مجھے اس فارغ اور بیکار شخص سے نفرت ہے جسے کسی دنیاوی اور اُخروی عمل کی پرواہ نہیں۔

(المصنف ابنِ اَبی شیبہ، ج19، ص340، ح37282،(دار کنوز اشبیلیا ریاض)

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مدت تک صوفیہ کرام کی صحبت اختیار کی، تو ان کے دو جملے نے مجھے بہت زیادہ فائدہ دیا۔ ایک یہ کہ : "اَلْوَقْتُ سَيْفٌ، فَإِنْ قَطَعْتَهُ وَإِلَّا قَطَعَكَ "یعنی "وقت تلوار ہے، اگر تم نے اسے نہ کاٹا تو وہ تمھیں کاٹ دے گا"۔ اور دوسرا:"وَنَفْسُكَ إِنْ لَمْ تَشْغَلْهَا بِالْحَقِّ وَإِلَّا شَغَلَتْكَ بِالْبَاطِلِ "یعنی "تم نے اگر اپنے نفس کو حق و صداقت کے کاموں میں مشغول نہ کیا تو وہ تمھیں باطل کاموں میں لگادے گا"۔(الجواب الکافی، ج1 ص106)

امام رازی رحمۃ اللہ تعالی علیہ فرماتے ہیں: "خداعزوجل کی قسم! کھانا کھاتے وقت علمی مشغلہ ترک ہو جانے کا مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ وقت نہایت ہی قیمتی دولت ہے"۔ (عیون الأنباء فی طبقات الأطباء، ص12، دار الحیاۃ بیروت)

علامہ ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" میں خطیب بغدادی علیہ الرحمہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آپ راہ چلتے بھی مطالعہ جاری رکھتے"۔ (تذکرۃ الحفاظ، ج3، ص224، دار الکتب العلمیہ بیروت)

(5ایک بزرگ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "علماعقلا سب اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی سب سے اہم پونجی جس کو بچا بچا کر استعمال کرنا چاہیے، وقت ہے۔ لمحاتِ زندگی فراہم کرنے والا وقت درحقیقت بڑی غنیمت ہے، اس لیے اس کو بچا بچا کر رکھنا چاہیے کہ انسان کے ذمہ کام بہت ہیں جب کہ وقت اچک کر بہت جلد غائب ہے ہونے والی چیز ہے۔

(کتاب الذیل علی طبقات الحنابلہ، لأبن رجب، ج1، ص149، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ)

عظیم ترین مصنف:

امام اہلسنت مجدد دین وملت حضرت امام احمد رضا خان رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْہِ نے ایک ہزار سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں اور فتویٰ نویسی کی ابتداء سوا تیرہ سال کی عمر میں کی اور دن رات میں اڑھائی، تین گھنٹے کے قریب آرام فرماتے۔ بیماری کی حالت میں بھی کبھی مطالعہ و تصنیف و تحریر کو نہ چھوڑا بلکہ اگر کسی جگہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے جانا ہوا تو وہاں جانا اگر چہ ڈاکٹروں کے بقول سیر کے لیے ہوتا مگر آپ وہاں بھی اپنی کتابیں لے کر جاتے اور مطالعہ و تصنیف کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا، آپ کی انہی پر نور دینی خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں صحیح اسلامی عقائد موجود ہیں۔ یہ سب اللہ تعالی کی توفیق خاص کے ساتھ وقت کی اہمیت جاننے اور اسے صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔

(وقت کی اہمیت، ص5، مکتبہ علمی دنیا)

قارئینِ محترم !ان تمام حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک کامیاب انسان کی زندگی کا بنیادی راز وقت کی قدر و منزلت ہے۔ افسوس کہ آج کا انسان بالخصوص موبائل فون کے بے جا استعمال کے باعث تضیع اوقات کا شکار ہے۔ بچے ہوں یا بوڑھے، لڑکے ہوں یا لڑکیاں، ہر طبقہ اس فتنہ کی لپیٹ میں نظر آتا ہے، حالانکہ موبائل کا بامقصد استعمال یقیناً مفید ہے، لیکن اس کا غیر ضروری اور حد سے زیادہ استعمال قیمتی اوقات کو ضائع کر دیتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اسے صرف ضرورت اور افادیت تک محدود رکھا جائے، اور انسان اپنی زندگی کا واضح مقصد اور نصب العین متعین کرے۔ ساتھ ہی اپنے شب و روز کو منظم انداز میں ترتیب دے مثلاً نمازوں کی بروقت اور باجماعت ادائیگی، تلاوت قرآن واذکار، علمی مشاغل، کسب معاش، گھریلو ذمہ داریاں اور اچھی صحبت کے لیے متعین اوقات مقرر کرے۔ ابتدا میں کچھ دشواری ضرور محسوس ہو سکتی ہے، لیکن جب یہی معمول بن جائے تو اس کی برکتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں اور کامیابی انسان کے قدم چومنے لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وقت کی قدر اور اس کے درست استعمال کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



دینی و عصری دانش گاہوں کا تجزیہ

از: محمد امن فرحان، متعلم جامعہ اشرفیہ مبارک پور

وطن عزیز ہندوستان کی آبادی فی الوقت تقریباً ا، ارب ۲۵، کروڑ یا اس سے کچھ زائد ہے۔ اور آبادی کے لحاظ ملک ہندوستان کا شمار دنیا کے تمام ممالک میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے ۔ جس میں مختلف مذاہب و مسالک کے پیروکار سکونت پذیر ہیں۔

ہندوستان میں بے شمار تعلیمی دانش گاہیں موجود ہیں جن میں باشندگان ہند اپنے اپنے طرز پر اپنی علمی تشنگی بجھانے میں مصروف رہتے ہیں اور مستقبل کو تابناک بنانے کی مکمل کوشش کرتے ہیں تاکہ ملک و ملت کے لیے عروج وارتقا کی مسدود راہیں ہموار کر سکیں

سکان ہند کا تعلق خواہ پیشے کے جس طبقے سے ہو ان میں سے ہر فرد کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی بطریق احسن پرورش کریں اور انھیں زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کر سکیں۔

اگر ہم وطن عزیز کے تعلیمی دانش گاہوں کا جائزہ لیں اور انھیں تقسیم کریں تو دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا دینی ادارے جسے "مدرسہ" کے نام سے جانا جاتا ہے جہاں پر مسلمانوں کی آبادی میں سے صرف چار فیصد طلبہ ہی تحصیل علم لیے مدارس کا رخ کرتے ہیں اور دوسرا عصری ادارے جسے اسکول اور کالجز کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس میں دیگر مذاہب کی معیت میں مسلمانوں کی کثیر آبادی بھی تحصیل علم کے لیے جاتی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں طرح کی دانش گاہوں کے تعلیمی نصاب پر غور کیا جائے تو دونوں کا منہج و مقصد خود طشت از بام ہو جائے گا ۔

عصری اداروں کے نصاب میں عموماً جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں: علم ریاضی، انگریزی، ہندی، سائنس، سوشل سائنس، علم تاریخ، فلاسفہ، جغرافیہ، علم ہیئت و ہندسہ، علم طب، کیمسٹری، فزکس، سائکلوجی وغیرہ جن کو پڑھانے کا مقصد صرف دنیا کو بہتر سے بہتر بنانا ہے اور اس کے ذریعے ملک کو ترقی کی جانب رواں دواں کرنا ہے اور اس کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ تحصیل علم کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائے خواہ حکومت کے ماتحت ہو یا بذات خود کچھ کر کے مال وزر کو اکٹھا کیا جائے بس عصری ادارے یا اس میں پڑھنے والوں کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

اور دینی اداروں کے تعلیمی نصاب میں جو مضامین شامل ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں زبان کے طور پر: عربی، اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی کی معیت میں کچھ علم ریاضی کے ابتدائی چیزیں بھی پڑھادی جاتی ہے جس کی عموماًضرورت پڑتی رہتی ہے۔

نحو و صرف، ادب و بلاغت، منطق و فلسفہ، تاریخ و سیرت، فقہ اور اصول فقہ، حدیث اور اُصول حدیث، تفسیر اور اصول تفسیر ،تصوف اور علوم قرآن وغیرہ اور بعض اداروں کے نصاب میں خارجی مطالعے میں میں کچھ عصری مضامین بھی شامل درس ہوا کرتے ہیں جس سے کچھ حد تک عصریات سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے جب کہ اس کے برعکس عصری اداروں میں باضابطہ خارجی مطالعے میں ہی سہی دینیات کو شامل درس نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ عصری جامعات کے فارغین دینیات سے نابلد و ناآشناہی رہتے ہیں

دینی اداروں کے نصاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیاوآخرت دونوں کے متعلق آگاہی رہے اور اصل مقصد شریعت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھ سکے اور اس کی روشنی میں اپنی دنیاو آخرت کو سنوار سکیں

دینی اداروں نے شروع ہی سے امت کو بہترین علما،فقہا، محدثین و مفسرین اور مدبرین عطا کیے ہیں اور بعض عصری علوم کے موجد بھی فارغین مدارس ہی ہیں۔

اور عصر حاضر میں فارغین مدارس علوم دینیہ سے فارغ ہو کر عصری علوم میں بھی اپنی صلاحیت و لیاقت کا علم بلند کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں جب کہ اس کے برعکس عصری علوم کے فارغین اکثر و بیشتر دینی علوم سے ناآشناہی رہتے ہیں اب دینی و عصری علوم کے فارغین کے لیے ضروری ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو حقیر و کمتر نہ سمجھیں بلکہ ایک دوسرے کی معاونت کریں اور آپسی اختلاف و انتشار سے دائمی طور پر دور و نفور ہی رہیں اور باہمی اتفاق و اتحاد کی راہیں استوار کریں اور آپسی رائے مشورے سے ملک و ملت کو عروج وارتقا کے شوارع پر گامزن کریں ۔

اٹھو حشر بپا نہ ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا



مدارسِ اسلامیہ: عصری تقاضے اور تجدیدِ نو

از: محمد صادق الاسلام، متعلم: دارالعلوم علیمیہ، جمداشاہی

جہان علم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ اس کی ادائی کی پوری فکر ہونی چاہیے۔ ورنہ سخت گرفت کا اندیشہ ہے۔ اس ذمہ داری میں والدین اور اساتذہ کے ساتھ اگرچہ پوری ملت، معاشرہ اور مملکت بھی شریک ہیں، لیکن براہِ راست ذمہ داری والدین اور اساتذہ کرام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں کو اس ضمن میں سب سے زیادہ فکر مند بھی ہونا چاہیے۔ خصوصاً آج کے حالات میں تو اس طرف غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ معمولی سی غفلت نہایت خطرناک نتائج سے دوچار کر سکتی ہے۔

تعلیم کا صحیح مقصد:

"اللہ کا صالح بندہ بنانا ہے" یعنی طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی، جسمانی، علمی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں، کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں، نیز انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ان کے خالق و مالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں، ان سے وہ کماحقہ، عہدہ برآ ہو سکیں۔

دین اسلام اور عصری علوم و فنون:

ارشاد ربانی ہے: رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوا عَلَيۡهِمۡ آيَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتَٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الۡعَزِيزُ الۡحَكِيمُ (سورہ بقرہ: آیت 129)

ترجمہ: اے رب ہمارے! اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انہیں خوب ستھرا فرمادے۔ بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔ (کنزالایمان)

یہ خلیل کبریا شیخ الانبیا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے، یعنی مبعوث فرمودہ رسول علیہ الصلوۃ والسلام بندوں کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں گے۔

کلام الٰہی میں "کتاب" سے مراد قرآن مقدس ہے اور حکمت کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ حضور اقدس عالم ماکان ومایکون صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل عالم کو دین وشریعت اور معرفت الٰہیہ کی تعلیم کے علاوہ صنعت و حرفت، تجارت و معیشت، تاریخ و جغرافیہ، اخلاق و کردار فن حرب و ضرب، سیاسیات و سماجیات اور بے شمار علوم وفنون کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ کتب احادیث میں ان علوم وفنون سے متعلق احادیث مبارکہ موجود ہیں۔

اسلام وہ مذہب ہے جس کے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس رب تعالیٰ کی جانب سے پہلی وحی تعلیم و تعلم سے متعلق آئی اور اس پیغام اول میں قلم وکتابت کا ذکر ہوا۔

وحی اول: "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ: خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ: اقْرَأْ وَرَبُّكَ الَّذِي أَكْرَمُ ۔۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" (سورہ اقرا: آیت 1-5)

ترجمہ: پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا۔ پڑھو، اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔ (کنزالایمان)

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مبعوث فرمایا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّنَ رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ايته وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ مِنْ كَانُوا مِنْ لَبَيْنَ۔ (سورہ جمعہ: آیت 2)

ترجمہ: وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انہیں پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں اور بے شک وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔ (کنزالایمان)

ایسا مذہب جس میں پیغام اول تعلیم و تعلم سے متعلق ہو، وہ مذہب فائدہ بخش علوم وفنون کی تعلیم و تربیت سے کیوں کر منع کر سکتا ہے۔ ہاں، جو علوم وفنون دنیا یا آخرت کے لیے مضر ہوں، ان کی ممانعت ضرور ہوگی۔ جس کی تفصیلات فقہ و فتاوی کی کتابوں میں موجود ہیں۔ (مدارس اسلامیہ، نصاب و نظام۔ ص9)

مسلم بچوں کی تعلیم اور ہمارے دو مقاصد:

مقصد اول یہ کہ مدارس اسلامیہ کے طلبہ کو عصری علوم سے آراستہ کیا جائے۔ مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں چار، پانچ ضروری اسکولی مضامین مثلاً انگلش، حساب، سائنس، سوشل سائنس شامل کیے جائیں۔ اسی طرح جغرافیہ، ہسٹری، ہندی و دیگر ضروری مضامین بھی شامل کیے جائیں۔

ادارہ کی جانب سے طلبہ کے لیے میٹرک (Matriculation) کے امتحان کا نظم کیا جائے، تاکہ مدارس اسلامیہ کے فارغین مساجد و مدارس کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی تبلیغ دین و سنیت کی خدمت سر انجام دے سکیں۔ انہیں مختلف شعبہ جات میں

معاش کے مواقع فراہم ہوں اور ان شعبہ جات سے منسلک افراد تک آسانی کے ساتھ دین وسنیت کا پیغام پہنچایا جاسکے، اور اہل سنت وجماعت سے متعلق پھیلنے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو۔

ہمارا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسکول وکالج کے نصاب تعلیم میں بقدر ضرورت اسلامی، مضامین داخل کیے جائیں، تاکہ طلبہ اپنے ایمان وعمل کی حفاظت وصیانت کر سکیں۔

تعلیم اسلامیہ کے لیے چند باتیں:

1۔ جب مدارس کے اندر اساتذہ کی ضرورت ہو تو اس وقت ان کی صلاحیتوں کو جانچا جائے، اور باصلاحیت محنتی، اور تجربہ کار اساتذہ کا انتخاب کیا جائے۔

2نئے اساتذہ کی پہلے تربیت کریں یا پھر ان کو تدریب المعلمین کورس کرائیں یا پھر جو درس دینے کی کتب دی جائے ان کو ان کی تربیت دی جائے۔

-3اساتذہ جن کتابوں میں دلچسپی لے رہے ہوں وہی کتب ان کو دی جائیں اور ان کو آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

4۔اساتذہ کو تدریس کے لیے وہی کتب دینی چاہیے جس میں وہ کامل مطالعہ کے بعد آسانی کے ساتھ پڑھا سکیں، کیوں کہ فنی اور بڑی کتابوں کے مطالعے کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔

5۔ ہر ماہ میں ایک بار اساتذہ کے ساتھ تعلیمی معاشرہ اور تعلیمی جائزہ لیتے رہیں۔ ہر وقت طلبہ کی کارکردگی دیکھی جائے اگر طلبہ اعلی نمبرات سے پاس ہو رہے ہیں تو انعام کے ذریعے ان کے ساتھ حوصلہ افزائی کی جائے۔طلبہ کسی کتاب میں ادنی یا ناکام ہوتے ہیں تو ان کی کونسلنگ کی جائے۔

-7امتحانات کے وقت ہر ایک ساتھ اچھائی کا معاملہ کریں۔ پیپر کے متعلق ان کو آگاہی دیتے رہیں کس طرح اور کیسا ہو گا۔ انصاف کے ساتھ امتحان لیا جائے تاکہ طلبہ بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔

8۔طلبہ کو تکرار کرنے پر ابھارا جائے۔ مطالعہ اور حفظ اسباق کے لیے مکمل وقت دیا جائے۔

9۔ مدارس اسلامیہ کے اندر ایک کتب خانہ بنوائیں اور اس کے اندر ہر جماعت کو موقع دیا جائے، ہر دن کم سے کم ایک گھنٹہ کتب خانہ میں پڑھنا لازمی قرار دیا جائے۔

10۔ مدارس اسلامیہ کا نصاب بناتے وقت ہر دن طلبہ کو کتب کا درس دیا جائے تاکہ آسانی کے ساتھ کتب سمجھ سکیں یا پھر یاد کر کے آگے مطالعہ کر سکیں جو کہ ہر طلبہ کے لیے ممکن ہو۔

11۔ درس نظامی کا مقصد استعداد سازی کے ہیں۔ جن کتابوں کو پڑھنا اور پڑھانا ضروری ہے ان کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ طلبہ جو فن پڑھیں اس میں ماہر ہو جائیں۔

12۔ اگر طالب علم فنی یا اہم کتب میں ناکام ہو گیا ہے تو اگلی جماعتوں میں نام نہ ڈالیں۔ حتی کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ رزلٹ کے بعد جب تک پڑھائی شروع نہیں ہوتی ہے ان کو تیاری کرنے کے لیے وقت دیا جائے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْت

مفتی سید مسعود علی نوری: ایک تعارف

از: مفتی غلام مصطفی نعیمی ہاشمی

حضرت علامہ مفتی سید مسعود علی نوری رحمہ اللہ 9 ذوالقعدہ 1447ھ، مطابق 27 اپریل 2026ء، بروز پیر (دوشنبہ) صبح تقریباً نو بجے اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ ہم حضرت رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا سید غلام محی الدین قادری صاحب اور جملہ اہل خانہ کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی کامل مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

جس وقت اس ماہنامہ کے لیے تعزیتی نوٹ تحریر کیا جا رہا تھا اسی دوران محب گرامی مولانا سید غلام محی الدین قادری صاحب کی جانب سے حضرت علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر مشتمل ایک مضمون موصول ہوا۔ لہٰذا وہ مضمون ہی بطور تعزیت اس شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے، تاکہ اہل علم و محبت حضرت علیہ الرحمہ کی علمی و دینی خدمات سے استفادہ کر سکیں اور ان کے لیے دعائے مغفرت کا اہتمام کریں۔ **(مدیرِ اعلیٰ)**

تاریخ میں ایسے کتنے ہی علما و مبلغین گزرے ہیں جو خدمات کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں تھے لیکن ان کی زندگیاں سادگی سے بھرپور اور شہرت و ناموری سے دور رہیں۔ خود انہیں اس کا خیال تھا نہ حاجت، مقصد بس کام تھا، سو کام کرتے رہے اور ان کی خاموش تبلیغ سے دین و سنیت کا کام ہوتا رہا۔ ایسے ہی ایک عالم دین حضرت مولانا مفتی سید مسعود علی نوری برکاتی بھی ہیں، جنھوں نے زندگی کا بیش تر حصہ تدریس اور تبلیغ دین میں گزارا۔ جہاں رہے دین و سنیت کا کام کیا۔ جہاں ٹھہرے تہذیب و تمدن کو سنوارا۔ جہاں قیام کیا اس کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

تعارف

سید مسعود علی نوری برکاتی، صدر العلما، امام النحو علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ کے بڑے داماد تھے۔ ان کی پیدائش اتر پردیش کے مردم خیز خطے ریاست رامپور کے ایک قصبے نریت نگر میں ہوئی۔ آپ کے والد مولانا سید سخاوت علی نعیمی ایک سنجیدہ اور مخلص عالم دین تھے۔ جامعہ نعیمیہ مرادآباد کے فارغ التحصیل تھے۔ باپ عالم دین تھے تو والدہ محترمہ سیدہ روشنی بیگم بھی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں۔ نیک ماں باپ کی صحبت میں پروان چڑھے تو بچپن ہی سے علم کی طرف جھکاؤ اور رغبت فطری تھی۔ والد گرامی سے ناظرۂ قرآن تا حفظ قرآن تعلیم حاصل کی۔ ان دنوں آپ کے والد بغرض امامت نریت نگر سے متصل

ایک چھوٹے سے گاؤں پیپل سانہ میں مقیم ہو گیے تھے۔حفظ قرآن کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے شہر رامپور میں واقع جامع العلوم فرقانیہ میں تشریف لے گیے جہاں آپ نے مروجہ درس نظامی کی تکمیل کی اور سند و دستار سے نوازے گیے۔ان کے ہم سبق ساتھیوں میں محدث رامپور مفتی سید شاہد علی میاں علیہ الرحمہ (سابق قاضی شرع رامپور) بھی تھے۔جن سے تا حین حیات بڑے اچھے مراسم و تعلقات رہے۔

فراغت اور تدریسی زندگی کا آغاز

سال 1975 میں بھارت ایک اتھل پتھل بھرے دور سے گزر رہا تھا۔سیاسی ناچاقیوں اور رنجشوں کی بدولت اس سال ایمر جنسی کا نفاذ عمل میں آیا تھا۔جو 25جون 1975 سے 21مارچ 1977 تک جاری رہا۔حکومتی سختی کا اثر ہر شعبہ زندگی پر تھا۔اسی ماحول میں سن 1976 میں آپ کی فراغت ہوئی۔فراغت کے بعد ہی کسی شناسا کے توسط سے صدر العلما نے خط لکھ کر آپ کو میرٹھ بلایا۔اس طرح آپ کا پہلا تقرر اس وقت کے ایک معیاری ادارے جامعہ اسلامیہ عربیہ اندر کوٹ میرٹھ میں ہوا۔جہاں امام النحو علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی جیسے نابغہ روزگار عالم دین اپنی بساط علم سجائے بیٹھے تھے۔اولاً آپ کو شعبہ حفظ و قرأت تفویض کیا گیا۔آپ نے اس شعبے میں جی جان سے محنت کی۔تقرری کے دو سال بعد ہی امام النحو علیہ الرحمہ کا وصال ہو گیا۔بعد وصال بھی سید صاحب ادارے سے وابستہ رہے اور شغف و لگن کے ساتھ اپنے شعبے میں محنت کرتے رہے۔آہستہ آہستہ آپ کو درس نظامی کی کتابیں بھی پیش کی گئیں۔آپ کی تدریسی مہارت کھلتی گئی اور درس نظامی کی کتابیں بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ آپ نے تفسیر بیضاوی تک کی منتہی کتابوں کا درس بھی دیا۔

ازدواجی زندگی

سید مسعود علی صاحب کا تقرر امام النحو کی زندگی ہی میں ہوا تھا۔حالانکہ امام النحو آپ کی تقرری کے دو سال بعد ہی واصل الی اللہ ہو گیے لیکن سید مسعود صاحب خلوص و محبت کے ساتھ تعلیم و تدریس میں منہمک رہے۔آپ کی عادات و اطوار سے متاثر ہو کر تقرری کے آٹھوے سال سن 1984 میں امام النحو علیہ الرحمہ کے شہزادگان نے صدر العلما کی بڑی شہزادی سیدہ انعام فاطمہ سے آپ کا عقد کر دیا۔اس طرح سید مسعود علی صاحب کی شخصیت کو ایک بزرگ عالم ربانی سے نسبت کا شرف بھی حاصل ہوا، جو بلا شبہ ایک بڑا اعزاز ہے۔اس نکاح میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکتیں رکھیں، چار بیٹے اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔فرزند اکبر، مولانا سید غلام محی الدین قادری 2۔فرزند اوسط مولانا سید فخر الدین قادری 3۔فرزند اوسط مولانا سید قطب الدین 4۔فرزند اصغر سید محمود علی۔اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیاں بھی عطا فرمائیں۔

ترک وطن اور رام نگر میں سکونت

کہا جاتا ہے کہ علما کا رزق زمین کے مختلف حصوں میں بکھرا ہوا ہے۔ بغرض تدریس و تبلیغ یہاں وہاں جاتے رہتے ہیں اور جائے سکونت بدلتی رہتی ہے۔ سید صاحب کے والد نرپت نگر سے قریبی گاؤں پیپل سانہ منتقل ہوئے تھے اور سید مسعود صاحب ازدواجی زندگی کے دو سال بعد نینی تال کے سیاحتی شہر رامنگر وارد ہوئے۔ یہاں آپ نے جامع مسجد کی امامت و خطابت اور درس گاہ سنبھالی۔ بعد میں آپ نے اہل خانہ کو بھی یہیں بلا لیا اس طرح نرپت نگر کے بعد رامنگر آپ کا مسکن قرار پایا۔ یہیں پر آپ کی ساری اولادیں پروان چڑھیں۔ آپ کی دو بہنیں بھی اسی شہر میں بیاہی گئی تھیں، اس طرح رام نگر آپ کا وطن ثانی بن گیا۔

تدریسی و تبلیغی زندگی

سید صاحب قبلہ مزاجی اعتبار سے درس و تدریس ہی کے دلدادہ تھے۔ اس لیے پوری زندگی تعلیم و تعلم ہی میں گزری۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ میرٹھ کے علاوہ آپ نے بریلی شریف کے معیاری ادارے دارالعلوم مظہر اسلام میں بھی کئی سال گزارے۔ یہاں آپ نے مفتی محمد اعظم صاحب، مفتی دارالافتا مظہر اسلام بریلی شریف کے نائب اور ادارے کے نائب شیخ الحدیث کے طور پر خدمات انجام دیں۔ کلیہ کنیزان فاطمہ ممبرا مہاراشٹر میں بطور شیخ الحدیث درس دیا۔ ممبئ عظمی کے عظیم بزرگ فقیہ ماہم حضرت مخدوم علی ماہمی علیہ الرحمہ کے آستانہ پر واقع دارالعلوم مخدومیہ میں بھی ایک زمانے تک منتخب کتابوں کا درس دیا۔ قرب وجوار کی مساجد میں امامت و خطابت کے ذریعے تبلیغ دین کا کام بھی انجام دیا۔ جنت ارضی کشمیر کے مختلف خطوں میں حدیث و افتا کی خدمات سر انجام دیں۔ اس کے علاوہ شہر رام نگر، ہلدوانی اور رانی کھیت میں بطور شہر قاضی بھی عوام اہل سنت کی بھرپور خدمت فرمائی۔

بیعت و خلافت اور سلسلہ ارادت

سید صاحب، نے شہزادۂ اعلی حضرت، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا نوری برکاتی قدس سرہ العزیز کے ہاتھ پر بیعت کا شرف حاصل کیا، اور مرشد گرامی کی نسبت کو اپنے نام کا جزو بنا کر سید مسعود علی نوری برکاتی کہلائے۔ طبیعت میں شریعت کی پاس داری کا جذبہ پہلے ہی تھا۔ پیر کامل کی صحبت نے اسے مزید تیز کیا اور زندگی اسی سانچے میں ڈھلتی گئی۔ جانشین مفتی اعظم ہند، تاج الشریعہ حضرت مفتی اختر رضا ازہری قادری، شیخ الاسلام حضرت علامہ سید مدنی میاں کچھوچھوی اور شیخ ملت حضرت مولانا سید نعیم اشرف جائسی سے آپ کو شرف خلافت حاصل تھا۔ آپ نے ملک کے مختلف خطوں میں بیعت و ارادت کا حلقہ بھی بنایا۔ یوپی، کرناٹک اور دیگر علاقوں میں آپ کے مریدین ہیں۔ بیرون ملک ماریشش میں آپ کے مریدین کا خاصا بڑا حلقہ پایا جاتا ہے۔

ملک وبیرون ملک کے اسفار

مفتی سید مسعود صاحب کی پوری زندگی درس و تدریس اور تبلیغ دین متین میں صرف ہوئی، اس حوالے سے ملک کے مختلف حصوں کے سفر ہوتے ہی رہے۔ اتر پردیش سے کرناٹک، مہاراشٹر، اتراکھنڈ راجستھان اور ملک کے کئی صوبوں میں جانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ بیرون ممالک آپ نے عرب شریف، برطانیہ، ملیشیا اور ماریشش کے سفر کیے۔ ماریشش میں آپ کا متعدد بار آنا جانا ہوا۔ پہلی مرتبہ آپ کے فرزند اکبر مولانا سید غلام محی الدین کی دعوت پر وہاں پہنچے تھے۔ بعدہ بیعت وارادت کا سلسلہ جاری ہوا جس کے باعث متعدد مرتبہ یہاں آنا جانا ہوا۔

ذوق تلاوت

سید صاحب ایک بہترین حافظ اور خوب صورت لب ولہجے میں تلاوت کرنے والے قاری بھی تھے۔ تلاوت قرآن کا نہایت عمدہ ذوق پایا تھا۔ اکثر خالی اوقات میں قرآن کریم کی تلاوت فرماتے رہتے۔ اہل خانہ کو بھی قرآن کی تلاوت کا شوق دلاتے اور مسلسل اس کی تاکید کرتے۔ اہل خانہ کو قرآن کریم سے مربوط کرنے کے لیے آپ نے پارہ جاتی سیٹ خرید کر وقف علی الاولاد کیا تاکہ اہل خانہ کو رغبت ہو اور انہیں تلاوت قرآن کا ثواب بھی ملتا رہے۔

انتقال پرملال

عرصہ دراز سے سید صاحب بیمار چلے آرہے تھے۔ بیماری کے باوجود بھی معمولات شب وروز میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ عمر کی 73 ویں بہار تھی، کمزوری مسلسل بڑھ رہی تھی جس کی وجہ سے مسجد کی حاضری متاثر تھی۔ کئی سال قبل اہلیہ داغ مفارقت دے چکی تھیں اس لیے یک گونہ اکیلے پن کا احساس بھی تھا۔ انسانی زندگی میں یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب خوب چلنے والا مسافر بھی تھکن کا احساس کرنے لگتا ہے اور دل آرام کرنے کو چاہتا ہے۔ سید صاحب نے ساری زندگی کام کیا، اب شاید آرام کا وقت آ گیا تھا۔ نو ذوالقعدہ 1447 ھ مطابق ستائیس اپریل 2026 بروز دوشنبہ صبح قریب نو بجے اللہ کے گھر سے بلاوا آیا اور اطاعت گزار بندے نے لبیک کہتے ہوئے رخت سفر باندھ لیا: أنا للہ وانا الیہ رجعون

بعد عصر فقیر ان کا آخری دیدار کرنے پہنچا۔ سر پر عمامہ باندھے، چہرے پر پُر سکون مسکراہٹ لیے، اس طرح لیٹے ہوئے تھے مانو کتنی لذت وسکون کی نیند آرہی ہو۔ چہرے پر حد درجہ نور اور طمانیت کا آثار صاف ظاہر تھے۔ بے اختیار دل سے یہی آواز نکلی:

نشان مرد مومن با تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لب او ست

یعنی: میں تجھے مرد مومن کی نشانی بتاتا ہوں۔ جب اسے موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے "

انتقال کے وقت آپ کے فرزند اکبر مولانا سید غلام محی الدین بنگلور اور فرزند اوسط مولانا سید فخر الدین ماریشش میں تھے، اس لیے تدفین اگلے دن بعد نماز مغرب ہوئی۔ نماز جنازہ فرزند اکبر سید غلام محی الدین قادری صاحب نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں علماے کرام کی کثیر تعداد شامل تھی۔ اہم شرکا میں نبیرہ حضور سرکار کلاں حضرت سید حسین نجم الثاقب اجملی صاحب، سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد، مولانا مجتبیٰ حسن اشرفی صاحب سنبھلی، شہزادہ حضرت سید یزدانی میاں صاحب، سید محمد کلیم اشرف سنبھل، مولانا سید محمد رضوانی سنبھل، قاری رضاء الحسن، حافظ سید احمد رضا نوری، حافظ نقش علی، مفتی محمد سلیم مصباحی، مفتی محمد اعظم اویسی، مفتی جنید القادری، مولانا امجد، قاری محمد فاروق، قاری محمد رئیس، قاری محمد فرقان، حافظ محمد عرفان، حافظ محمد امتیاز وغیرہ شامل ہیں۔ بعد تدفین دعا کرانے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ اس طرح ایک عالم ربانی ایک قابل رشک زندگی گزار کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا۔

موت اس کی ہے، کرے جس کا زمانہ افسوس

یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

تعزیت

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

آہ! مدیر ماہنامہ اشرفیہ علامہ مبارک حسین مصباحی رحمہ اللہ

برادر اصغر مفتی سید شہباز اصدق غوثی صاحب حفظہ اللہ کے ذریعے یہ نہایت افسوسناک خبر موصول ہوئی کہ ادیب شہیر، حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب، استاذ جامعہ اشرفیہ و چیف ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، 4 جون 2026 کو اس دار فانی سے رخصت ہو کر راہیِ ملک بقا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

حضرت موصوف نہایت باکمال شخصیت کے حامل تھے۔ آپ بیک وقت فصیح اللسان مقرر، صاحبِ طرز ادیب، ممتاز محقق اور جہاں دیدہ مفکر تھے۔ عرصۂ دراز تک آپ ماہنامہ اشرفیہ کے مدیر اعلیٰ رہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے اس علمی و ادبی مجلے کو بام عروج تک پہنچایا۔ آپ کے انتقال سے نہ صرف جامعہ اشرفیہ کی فضا سوگوار ہے، بلکہ علم و ادب اور فکر و فن کی دنیا میں بھی ایک ناقابل تلافی خلا پیدا ہو گیا ہے۔

ہم خانقاہ غوثیہ اصدقیہ کے تمام وابستگان اور ماہنامہ الغوث کی پوری ٹیم کی جانب سے حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب کے اہل خانہ سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت حضرت موصوف علیہ الرحمہ کو اپنی جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور جمیع پسماندگان کو صبر جمیل و اجر عظیم سے نوازے۔

آمین بجاہِ سیدِ المرسلین ﷺ

سوگوار:

سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی غفرلہ

خانقاہ غوثیہ اصدقیہ، سہسرام بہار



دینی معلومات

سوال-جواب کارنر

بچوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اسلامی معلومات فراہم کی جائیں، دینی واقعات، مذہبی ثقافت اور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اگر بچے کم عمری ہی سے اسلامی تاریخ، ثقافت اور ادب کے موضوعات پر توجہ دیں گے تو ان کا مستقبل یقیناً پُر نور اور تابناک ہو گا۔

اس کالم میں چند سوالات اور ان کے جوابات شامل ہیں۔ طلبہ و طالبات سے گزارش ہے کہ ہر سوال کو اس کے درست جواب کے ساتھ ملا کر درج ذیل وہاٹس ایپ نمبر پر ارسال کریں۔ آپ کے درست جوابات آئندہ شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ (ادارہ) مدیر کا وہاٹس ایپ نمبر +27838463037

سوالات	جوابات
سوال1: سب سے پہلے مصافحہ کس نے کیا؟۔	سیدنا ابراہیم علیہ السلام
سوال2: نبی اکرم ﷺ نے سب سے پہلے کس پر نماز جنازہ پڑھی ؟	حضرت سید احمد کبیر
سوال3: سب سے پہلے روئے زمین پر کس مسجد کی تعمیر ہوئی ؟	مسجد اقصیٰ
سوال4: کس مسجد کی بنیاد حضرت داؤد اور تکمیل حضرت سلیمان نے فرمائی	مسجد حرام
سوال5: دس محرم الحرام کو کس کی شہادت ہوئی ؟	شیخ عبد القادر جیلانی
سوال6: سیدہ زینب کن کی بیٹی ہیں ؟	زین العابدین
سوال7: سیدنا علی بن حسین کا لقب کیا ہے ؟	سیدنا علی بن ابی طالب
سوال8: بغداد میں کس ولی کا مزار مبارک ہے ؟	امام حسین
سوال9: حدیث کے مشہور امام محمد بن اسماعیل کس نام سے جانے جاتے ہیں ؟	حضرت اسعد بن زرارہ
سوال10: سلسلہ رفاعیہ کن بزرگ کی طرف منسوب ہے ؟	امام بخاری



تشکر و تحسین

ماہنامہ الغوث (مئی 2026) کے سوال و جواب کارنر میں صحیح جوابات ارسال کرنے والے معزز قارئین کے اسما

ناصرین پروین

بوکارو، جھارکھنڈ

ثانیہ منان

سہسرام

آشنا ترنم

محلہ باڑا، سہسرام، روہتاس، بہار

شمیلہ اختری اصدقی

دھنباد، جھارکھنڈ

سوال و جواب کے کارنر میں شرکت کرنے اور جوابات ارسال کرنے پر ہم آپ تمام کے ذوق علم اور شوق مطالعہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی آپ تمام کو حسنات و برکات سے مالامال فرمائے اور خیر کثیر سے نوازے۔ آمین

(ادارہ)